نئی لائبریری
غدار
ناول
کرشن چندر
6.00
نیا ادارہ

غـــدار

ناول

کرشن چندر

نیا ادارہ * لاہور

بار دوم : ۱۹۷۹ء

طابع و ناشر : مشتاق احمد چودھری
نیا ادارہ ، سویرا آرٹ پریس ، لاہور

اس ناول کے تمام واقعات و کردار فرضی ہیں ۔ کسی
قسم کی مشابہت کے لیے مصنف یا ناشر ذمے دار نہیں ۔

عاشق ترے عدم کو گئے کس قدر تباہ
پوچھا ہر ایک نے یہ مسافر کہاں کے ہیں
(داغ)

پہلا باب

و اگست ۱۹۴۷ء کو میں اپنے ننہال میں تھا ۔ میرا ننہال
لے گاؤں میں ہے ۔ لالہ گاؤں قلعہ سوبھا سنگھ سٹیشن کے
یب ہے ۔ سٹیشن سے کوئی پون میل سوا میل کا فاصلہ ہوگا ۔
لے گاؤں میں ہم براہمنوں کی آبادی زیادہ ہے ۔ اس کے بعد
یوں کے گھر ہیں ۔ سب سے کم آبادی مسلمانوں کی ہے ۔
میرا ننہال گورو گو سائیوں کا گھر کہلاتا ہے اور براہمنوں میں
سب سے اُونچا ہے ۔ ہزاروں سال سے ہم لوگ اسی گاؤں میں آباد
ہیں ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں اس سارے علاقے پر ہمارا راج
تھا ۔ اب بھی لالہ گاؤں کی سب سے اُونچی حویلی 'محلاں'
کہلاتی ہے ۔ اسے رمپال براہمنوں نے اپنے عروج کے زمانے
میں تعمیر کیا تھا ۔ حویلی کیا ہے ، پرانے زمانے کا ایک
قلعہ سا ہے ؛ جس کے شمال مغرب میں ریتیلے ٹیلوں اور کلّر کی
ماری ہوئی بنجر زمینوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے ؛ جہاں صرف
خار دار گھاس اُگتی ہے اور لمبے لمبے سرکنڈوں کے جھنڈ کے
جھنڈ اپنی لانبی لانبی سفید خوشوں والی کلغیاں لہرائے زمین
سے اُگتے ہیں اور جب ہوا سرسراتے ہوئے اُن میں سے گزرتی ہے
تو وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک یوں ڈولتے ہیں جیسے
لق و دق صحرا میں شتر مرغوں کے جھنڈ کے جھنڈ پر پھیلائے
بھاگے جا رہے ہوں ۔ مجھے سرکنڈوں کے جھنڈ بہت پسند ہیں ۔

غــدار

میں اور شاداں دوپہر میں ، جب اُس کی اماں سو جاتی تھی
یہیں ملا کرتے تھے حالانکہ محلاں کی حویلی کے بڑے درواز
کے سامنے جو کچا پہا جاتا تھا وہ کپاد کے زرخیز کھیتوں
سے ہوکر گزرتا تھا ۔ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں اُ
دنوں کپاد کی فصل جوان اور قد آور ہو چکی تھی اور اُس
سرسبز فصیلیں بہت سے منچلے عاشقوں کو پناہ دیتی تھیں
مجھے اور شاداں کو سرکنڈے کے جھنڈ ہی پسند تھے کیو
جب ہم باتیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے اور شادا
کے بھورے بالوں کی ایک لٹ اُس کے گورے ماتھے پر بک
جاتی تھی اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت اور اُداس
کے سائے الجھنے لگتے تھے تو اُس وقت خاردار گھاس ، کانوں
اور سرکنڈوں میں گزرنے والی ہوا کچھ عجیب طریقے سے ہمارے
دلوں سے سرگوشیاں کرتی تھی اور اُس کی میٹھی مدھم صداؤں
میں نادیدہ سپنوں کے گھنگھرو بجنے لگتے تھے ۔ اُس کی ریشمی
سرسراہٹ میں اُن سندر کہانیوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی
جب محبت ہر دیوار ، ہر فصیل ، ہر خلیج پھاند گئی تھی اور
تاریک اُفق پر ایک رنگین دھنک بن کر لہرائی تھی ۔ سرکنڈوں
میں تو ہوا باتیں کرتی ہے لیکن کپاد کے کھیت میں تو یوں
گھٹ کے رہ جاتی ہے جیسے اُسے ہر لحظہ سماج کا اور مذہب کا
اور پرانے اعتقادات کا ڈر ہو ! اور جس جگہ ہوا تک ڈرے وہاں
عشق کیا پنپے گا ؟ اس لیے ہم لوگوں نے سرکنڈوں کے جنگل
میں پناہ لی تھی جن کی سفید ریشمی کلغیاں پتلے لانبے نازک
تنوں کے اُوپر کھڑی ہمارے عشق کی طرح مغرور نظر آتی تھیں ۔

غـــدار

دو اگست کی دوپہر کا ذکر ہے - ہمارے پیچھے سرکنڈوں کا جنگل تھا اور جنگل کے پیچھے ہمارا گاؤں تھا اور ہمارے سامنے دور تک پھیلی ہوئی میلوں بنجر زمین تھی جسے کار نے مار دیا تھا - صبح بارش ہو چکی تھی لیکن آسمان پر سفید بادل مرغوں کی طرح سینہ پھیلائے اپنے پوٹے میں بارش کے دانے چھپائے اب بھی کہیں کہیں چل رہے تھے - ہوا میں پانی کی نمی تھی اور مٹی کی سوندھی سوندھی مہک - اور دور مغربی اُفق پر روشنی کچھ ایسی ہلکی تھی ، اتنی شفاف تھی گویا ابھی پگھل کر کسی قوس قزح کو جنم دے گی -

میرا ہات شاداں کے ہات میں تھا اور ہم دونوں اس اُفق کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے اُمید ایک مسافر ہو اور اُسی شفاف راستے سے ادھر آنے والی ہو -

میں نے شاداں کا ہاتھ آہستہ سے دبایا اور اُس سے کہا :
" ایک دن تم مجھے بھول جاؤ گی ! "

شاداں کے سینے سے ایک آہ اُبھری مگر وہ خاموش رہی - اُس نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا - اور وہ اس سوال کا جواب بھی کیا دیتی جو ابتدائے آفرینش سے عورت مرد سے اور مرد عورت سے پوچھتا چلا آیا ہے ؟

کتنا پرانا سوال ہے لیکن ہر بار کتنا نیا معلوم ہوتا ہے - معلوم ہوتا ہے جیسے آج پہلی بار پوچھا گیا ہے -

میں نے پھر کہا : " ایک دن تمھاری شادی ہو جائے گی - "

" ہاں - میری شادی ہو جائے گی - اور بالکل اسی طرح

ہوگی جس طرح تمہاری ہو چکی ہے -"

اُس نے آہستہ سے ، میری طرف دیکھے بغیر ، کہا - اُس کی نگاہیں ابھی تک اسی اُفق پر گڑی تھیں -

"میری شادی تو میرے ماں باپ نے بچپن ہی میں کر دی تھی -" میں نے احتجاجاً کہا -

شاداں بولی : "اور تم کیا سمجھتے ہو میں اپنی مرضی سے شادی کر سکوں گی ؟"

میں نے سر جھکا لیا -

شاداں نے اُفق سے نگاہیں ہٹا لیں ، جیسے وہاں سے مایوس ہو چکی ہو - پھر اُس نے میرے جھکتے ہوئے اُداس چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کے اونچا کیا - پھر اُس نے اپنے گلابی رخسار میرے رخساروں سے لگا دیے اور دھیمے دھیمے بڑے پیار اور مضبوطی سے بولی :

"یوں تو میری شادی بھی ہو جائے گی اور بچے بھی ہوں گے میرے اور میں اُن کے لیے ایک اچھی ماں ، اپنے خاوند کے لیے ایک نیک اور اطاعت شعار بیوی بھی بن جاؤں گی اور میرا گھر ہوگا اور زندگی کی ساری خوشیاں جو ایک عورت چاہتی ہے وہ مجھے نصیب ہوں گی مگر کہیں پر میرے اندر ، میرے بہت گہرے اندر اور میری کوکھ سے بھی بہت دور اندر ، جہاں کہیں عورت کی روح رہتی ہے ، وہاں تم ہمیشہ موجود رہو گے !"

"تم مجھے یاد کرو گی ؟"

شاداں کچھ کہنے والی تھی کہ اتنے میں دور کہیں سرکنڈوں کے جھنڈ میں سرسراہٹ ہوئی اور وہ ایک دم خاموش ہوگئی ۔ اور ہم دونوں اس سرسراہٹ کو سانس روک کر سننے لگے ، فکر اور حیرت کے ساتھ ۔ کیونکہ اس وقت ادھر کوئی نہ آتا تھا ۔

سرسراہٹ جب قریب آنے لگی تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دبے پاؤں چل کر جھنڈ کے دوسری طرف ہوگئے ۔

یکایک سرسراہٹ ایک خاص جگہ پر چل کر رک گئی ، پھر کسی نے کہا :

"السلام علیکم !"

"وعلیکم السلام ۔"

شاداں نے دوسری آواز پہچان لی ۔ وہ چیخ مارنے ہی والی تھی کہ میں نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ دوسری آواز میں نے بھی پہچان لی تھی ۔ یہ اُس کے بھائی طفیل کی آواز تھی ۔ طفیل اور شاداں دونوں لاہور کالج میں پڑھتے تھے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں ، اپنے گاؤں میں ، آئے ہوئے تھے ۔

پہلی آواز والے مرد نے کہا : "مجھے چک تارہ سے پیر قلندر شاہ نے بھیجا ہے ۔"

"کون پیر قلندر شاہ ؟"

"وہی زبر گنج والے پیر قلندر شاہ ۔"

"کیا پیغام ہے ؟"

"وہ پیغام نمبردار سربلند کے نام ہے ۔"

"میں سربلند کا بیٹا طفیل ہوں ۔"

نووارد کچھ دیر تک چپ رہا ، پھر آہستہ سے بولا :

" پیر قلندر شاہ نے کہلوایا ہے آپ لوگوں نے ابھی تک لالہ گاؤں میں وہ سلسلہ شروع نہیں کیا ہے ۔ یہ غلط بات ہے ۔ پندرہ اگست کی رات تک سب فیصلہ ہو جانا چاہیے ۔"

"کیسا فیصلہ ؟"

" پیر قلندر شاہ نے کہا ہے پندرہ اگست تک گاؤں میں جتنے ہندو جوان ہیں اُن سب کو قتل کر دیا جائے ۔ جتنی جوان عورتیں ہندوؤں کی یہاں پر اکٹھی ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں یا آس پاس کے علاقوں سے آ رہی ہیں اُن سب کو رکھ لیا جائے ۔ البتہ بڈھے مردوں ، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا جائے ۔"

شاداں میرے سینے سے زور سے لگ گئی ۔ ہم دونوں کے دل دھک دھک کرنے لگے ۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زور سے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے ۔

تھوڑی دیر کے بعد طفیل بولا : "ایک پیغام میرے باپ نے بھی تمھارے پیر قلندر شاہ کے نام دیا ہے ۔"

" وہ کیا ہے ؟" نووارد بولا ۔

" میرے باپ نے کہا ہے یہ کام ہم سے نہ ہوگا ۔ صدیوں

سے ہم لوگ اسی گاؤں میں رہتے چلے آئے ہیں ، ہم سے یہ کام نہ ہوگا ۔"

"اُس صورت میں ہم چک تارہ والے خود آ کے یہ کام کریں گے ۔" نووارد نے طفیل کو دھمکی دیتے ہوئے کہا ۔ طفیل چپ رہا ۔ بہت دیر تک سرکنڈوں کے جنگل میں خاموشی رہی ۔ آخر نووارد نے سکوت توڑتے ہوئے کہا : "اچھا تو میں جاتا ہوں ۔"

دو انسانوں کے قدم سرکنڈوں کے جنگل میں الگ الگ سمت کو گھومے اور ہم سے دور ہوتے گئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد جنگل میں سناٹا چھا گیا ۔

میں نے جلدی سے شاداں کو اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا : "اب تم فوراً گھر چلی جاؤ ۔"

وہ زور سے میرے سینے سے چمٹ کر بولی :

"نہیں ، نہیں ۔ میں نہیں جاؤں گی ۔ جہاں تم جاؤ گے وہاں جاؤں گی !"

میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے مسکرا کر کہا : "تم نے سب کچھ سن لیا ہے نا ؟"

"نہیں ، نہیں ۔" وہ متوحش نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی : "وہ ایسا نہیں کر سکتے ! ـــــ سچ ! وہ ایسا نہیں کر سکتے ! ! ہم سب لوگ تو اسی دھرتی کی اولاد ہیں ۔"

"دھرتی تو کبھی زہر نہیں اُگلتی شاداں ۔ دھرتی سے تو

ہری ہری کونپلیں ہی پھوٹتی ہیں - لیکن تم نے دیکھا ہوگا کہ جب باہر کی مسموم ہوائیں چلنے لگتی ہیں تو اُن کی آن میں ہری بھری کھیتیاں اُجڑ جاتی ہیں! اس میں دھرتی کا کیا قصور؟"

شاداں نے سر جھکا لیا - میں نے اُسے اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے کہا: "تم جلدی سے گھر جاؤ ورنہ غضب ہو جائے گا - سینکڑوں بار ملنے پر بھی جس چیز کا فیصلہ نہ ہو سکا اُس کا آج کیا راستہ نکلے گا - وہ لوگ بہت چالاک ہیں شاداں - وہ لوگ جو ہمارے ملک کے ٹکڑے کرنے جا رہے ہیں سب سے پہلے اُنھوں نے ہمارے دل کے ٹکڑے کیے تھے! تقسیم تو پہلے دلوں ہی سے شروع ہوتی ہے!"

"یہ بات تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟" شاداں شکایتاً بولی -

"تم سے نہیں، شاید یہ بات میں اب سرکنڈوں کے جنگل سے کہہ رہا ہوں - اُس راستے سے کہہ رہا ہوں جہاں اُمید کبھی میرے لیے مسافر بن کر نہ آئے گی! اب تم جلدی سے اپنے گھر جاؤ - میں محلاں میں جا کے خبر کرتا ہوں!"

شاداں روتی ہوئی چلی گئی - میں نے محلاں میں جا کے سب کو خبر کر دی - کئی دنوں سے لالے گاؤں میں آس پاس کے گاؤں سے براہمنوں اور کھتریوں کی بیاہتا لڑکیاں جمع ہو رہی تھیں - یہ خبر سنتے ہی ایک کہرام مچ گیا - تھوڑی دیر میں نمبردار سربلند دوڑتا دوڑتا ہمارے گھر آیا - وہ میری نانی ماتا ایشر کور کی بڑی عزت کرتا تھا - میری نانی گاؤں کی سب سے بڑی بوڑھی تھیں اور گاؤں میں کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا

سکھ ، کوئی اُن کا کہا نہ ٹال سکتا تھا ۔ اُن کی عمر پچاسی برس کی تھی مگر وہ تقریباً سو برس کی نظر آتی تھیں ۔ اُنھوں نے آتے ہی نمبردار کو آڑے ہاتھوں لیا :

"وے سربلند ۔" نانی نے نمبردار کو گالی دے کر کہا ، "تیرے سر میں خاک ! یہ میں کیا سنتی ہوں ؟"

سربلند نے آ کے ماتا ایشر کور کے پاؤں چھوئے ، بولا :

"اماں ! ہم تیرے بیٹے ہیں ۔ چک تارہ والے ہمارے جیتے جی اس گاؤں کی بہو بیٹیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے ! بستی کے سارے مسلمانوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے !"

سوکھتے ہوئے ہونٹوں پر خوشی کی مسکراہٹیں دوڑ گئیں ۔ ماتا ایشر کور جانتی تھیں کہ نمبردار سربلند کبھی جھوٹ نہیں بولتا ۔ اُنھیں اطمینان ہو گیا ۔ اور جب اُنھیں اطمینان ہو گیا تو سب کو اطمینان ہو گیا ۔ بندھے ہوئے بستر پھر کھول ڈالے گئے ۔ پوٹلیوں کا سامان باہر نکالا گیا ۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں چولہے چکی میں لگ گئیں اور جوان بہوئیں آئینہ دیکھ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگانے لگیں اور اپنی خوبصورتی پر خود ہی شرما کر گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپنے لگیں !

دو تین دن اطمینان سے گزرے ۔ کسی قسم کا کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا ۔ ہندو مسلمان مل کر گاؤں کے اردگرد پہرہ دیتے تھے ۔ پریشانی کی بات تھی تو یہی تھی کہ لالے گاؤں میں آس پاس کے علاقوں سے براہمنوں اور کھتریوں کے خاندان پناہ لینے کے لیے برابر چلے آ رہے تھے ۔ کہیں پر کوئی جھگڑا

نہ ہؤا تھا لیکن ، جیسے طوفان کی آمد سے پہلے پرندے ہوا سونگھ کر اپنے گھونسلے چھوڑ کر مخالف سمت کو اُڑنے لگتے ہیں ، اسی طرح سے چاروں طرف سے لالے گاؤں میں ہندوؤں کے قافلے اُمڈے چلے آ رہے تھے ۔

پانچ اگست کی شام کو گاؤں چک تارہ کی طرف سے ڈھول پیٹے جانے لگے ۔ ڈھولوں کی آواز بلند تر اور قریب تر ہوتی گئی ۔ محلاں کے اندر عورتیں چیخیں مار کر رونے لگیں ۔ بہت سی عورتیں بیہوش ہوگئیں ۔ بچوں بالوں نے رو رو کر کہرام مچا دیا ۔ عین اسی وقت نمبردار سربلند نے آ کر کہا : "چک تارہ سے پانسو مسلمانوں کا جتھا آ رہا ہے ۔ ہم لوگ مداخلت کرنے والے کل پچاس مسلمان ہیں ۔ میں اب آپ کو بچا نہیں سکتا ۔ آپ لوگ اپنی اپنی فکر کیجیے ۔"

سربلند کے جانے کے بعد وہ بھگدڑ مچی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا ۔ ماں بیٹی کو بھول گئی اور بیٹی باپ کو اور باپ اپنی اولاد کو ۔ جدھر جس کے سینگ سمائے محلاں سے بھاگ کر چل دیا ۔ تھوڑی دیر میں محلاں کی عالی شان حویلی ویران تھی ۔ صرف ایک اندھیرے کونے میں نانی پلنگ پر چپ چاپ لیٹی تھیں ۔ جب میں اُن کی پائینتی کے قریب آ کر کھڑا ہؤا تو وہ بولیں :

"وے منتھرے سڑیا توں نئیں گیا ؟"

"نانی ماں میں تمھیں لے کے جاؤں گا ۔"

"کیسے لے کے جائے گا ، میں تو چل نہیں سکتی ۔"

”میں تمھیں اپنے کندھے پر بٹھا کے لے جاؤں گا ۔“

”جب میرے اپنے بیٹے مجھے نہیں لے گئے تو تو کیا لے جائے گا !“ بوڑھی نانی آبدیدہ ہو کر بولیں ۔

”میں لے جاؤں گا ۔“ میں نانی کے قریب گیا تاکہ اُنھیں اپنے کندھے پر اُٹھا لوں ۔

”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا ! مجھے یہیں رہنے دے !“

ڈھولوں کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی ۔

”مگر نانی ماں یہ آواز نہیں سنتی ہو ۔ وہ لوگ قریب آ رہے ہیں ۔“

”میں ذرا اُونچا سنتی ہوں ۔“ نانی ماں بولیں ۔

”اور بھگوان کرے جو میں سنتی ہوں وہ کبھی نہ سن سکوں ۔ تم مجھے یہیں چھوڑ دو اور چلے جاؤ ۔ وہ مجھے کچھ نہ کہیں گے ۔ پیر قلندر شاہ ! ہونہہ ، پیر قلندر شاہ کا بچہ ، وہ آئے تو ذرا میرے سامنے ؟ جب وہ پیدا بھی نہ ہوُا تھا ، جب اُس کی ماں کا بیاہ ہوُا تھا ، میں خود چک تارہ گئی تھی اور اُس کی ماں کو شادی کا جوڑہ شگن میں دیا تھا ۔ وہ آئے تو سہی میرے سامنے ؟“

”مگر نانی ماں !“

”تم چلے جاؤ ۔ میں تم سے کہتی ہوں ۔ اپنا خون میرے سر مت چڑھاؤ ۔ میں زیادہ بات نہیں کر سکتی !“

نانی ماں نے پلٹ کر پلنگ پر کروٹ لے لی اور میری طرف

پیٹھ کر لی - اور میں سر جھکا کر محلاں سے باہر نکل گیا ......

بڑے دروازے سے باہر نکل کر میں پہیے پر ہو لیا جو کماڈوں کے بیچ میں جاتا تھا - یکایک مجھے کچھ یاد آیا اور میں پہیے سے پلٹ کر محلاں کے دوسری طرف چلا گیا ، جدھر سرکنڈوں کے جھنڈ تھے - اب ڈھولوں کی آواز کے ساتھ ساتھ اللہ اکبر کے نعروں کی آواز بھی صاف صاف سنائی دینے لگی تھی - اللہ اکبر یعنی خدا بہت بڑا ہے ؛ اور انسان بہت چھوٹا ہے : تنگ نظر ، کمینہ اور نفرت کا بندہ ہے اور تہذیب کے اُونچے سے اُونچے منارے پر چڑھ کر بھی وہ اپنی بد فطرت کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتا کیونکہ وہ محض ایک انسان ہے ، خدا نہیں ہے - اس لیے میں نے ان نعروں کو کوئی اہمیت نہ دی اور آخری نظر ڈالنے کے لیے سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا جہاں میں اور شاداں دوپہر میں بیٹھا کرتے تھے لیکن اب وہاں کوئی نہ تھا - میں نے بڑی حسرت سے اس جگہ کو دیکھا - یوں تو اُس جگہ میں کوئی خاص بات نہ تھی ؛ ایک ریتلا سا ٹیلا تھا جہاں ہم دونوں بیٹھا کرتے تھے - سامنے بنجر زمین تھی - اُفق مٹیالے بادلوں سے گھرا ہوُا تھا - یہاں کچھ بھی تو نہ تھا - لہلہاتے ہوئے پیڑ ، خوبصورت پھول ، رنگین شفق ، آبشار ، پہاڑ ، پانی ، جھیل — کچھ بھی نہ تھا جن سے اس زمین پر شاعری ہوتی ہے - پھر بھی یہ جگہ جنت کا ٹکڑا کیوں معلوم ہوتی تھی ؟

" شاداں ! شاداں ! ! " میں نے آہستہ سے آواز دے کر کہا - ہمارے ملنے کا یہی قاعدہ تھا - وہ آ کے سرکنڈوں میں چھپ

جاتی تھی اور جب میں آتا تھا تو اُسے آواز دیتا تھا اور وہ سرکنڈوں سے نکل کر میرے گلے سے لگ جاتی تھی ! مجھے معلوم تھا وہ اس وقت یہاں نہیں ہے ، پھر بھی میرے ضدی دل نے پکارا :

"شاداں ! شاداں ! !"

مگر وہاں کوئی نہ تھا ۔ جھنڈ خاموش کھڑا تھا ۔ سرکنڈوں کی کلغیوں پر شام کی سیاہی بکھرتی جا رہی تھی ۔ میں جلدی سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہؤا اور قلعہ سوبھا سنگھ کے ریلوے سٹیشن کی طرف دوڑنے لگا ۔ اگر میں رات کے ساڑھے آٹھ بجے کی گاڑی پکڑ کر نارووال چلا جاؤں تو مجھے نارووال سے لاہور جانے والی connecting ٹرین مل جائے گی ! لاہور میں میرے پتا جی رہتے تھے !

کوئی پون گھنٹے کے بعد میں چکر کاٹ کے قلعہ سوبھا سنگھ کے سٹیشن پر پہنچا تو تاریکی خاصی بڑھ چکی تھی ۔ سٹیشن کے قریب بڑ کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے درجنوں ڈال زمین پر لٹکے ہوئے تھے ۔ یہاں پر بہت اندھیرا تھا اور اندھیرے میں عجیب طرح کے سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے تھے ۔

ہر قدم پر موت نظر آتی تھی ۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھ گیا ۔ یکایک ایک سایہ بڑ کے ایک ڈال کے پیچھے سے مجھ پر لپکا ۔ میں نے پلٹ کر مدافعت کے لیے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا تو شاداں بھاگتی ہوئی میری بانہوں میں آ گئی ۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے ۔ اُس کی قمیص کی آستین پھٹی ہوئی تھی اور

غـــدار

وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آئی تھی -

اُس نے جلدی جلدی سے کہا : "میں نے طفیل سے سب کچھ کہہ دیا ہے - وہ تمھیں لاہور حفاظت سے پہنچا دے گا -"

"طفیل مجھے جان سے نہیں مار دے گا ؟"

"نہیں - کیونکہ میں نے اُس سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں اُس کے دوست آفتاب سے شادی کر لوں گی جو ایک مدت سے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے !" وہ جلدی جلدی گھبرائی ہوئی کہہ رہی تھی اور اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی -

"مگر طفیل کہاں ہے ؟"

"سامنے سٹیشن پر تمھارا راستہ دیکھ رہا ہے - لاہور پہنچ کر وہ تمھارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے نام لائے گا - اگر وہ خط نہ لایا تو اپنی جان لے لوں گی !" یکایک وہ رک گئی — پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی : "اب تم جاؤ !"

یکایک جیسے زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی ہو - یکایک میری ٹانگوں نے جواب دے دیا اور میں وہیں زمین پر بیٹھ کر شمشاد کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگا -

"میں کیسے جاؤں ؟ تجھے چھوڑ کر کیسے جاؤں ! شاداں ! نہیں میں نہیں جاؤں گا -"

وہ بولی : "اُٹھو ، یاد کرو - تمھارے بیوی اور بچے ہیں ، ماں اور باپ ہیں ، بہنیں اور بھائی ہیں — اُن سب کی حفاظت تمھارے ذمے ہے !"

"جہنم میں جائیں سب لوگ !" میں نے روتے ہوئے کہا ،

" میں یہیں رہوں گا ۔ میں مسلمان ہو جاؤں گا اور تم سے شادی کر لوں گا !"

" پھر میں تمھاری عزت نہیں کروں گی !" شمشاد نے آہستہ سے کہا ۔ پھر وہ جھکی اور اُس نے بڑے پیار سے مجھے زمین سے اُٹھا لیا اور ایک بچے کی طرح مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنی نرم ہتیلیوں سے میرے آنسو پونچھنے لگی ، اور اُس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی نگاہیں مجھ سے کہہ رہی تھیں :

"آؤ ! آج آخری بار میں اپنے ہاتھوں سے تمھارے آنسو پونچھ دوں کیونکہ اس کے بعد تمھارے آنسوؤں سے میرے ہاتھ کبھی گیلے نہ ہوں گے ۔ زندگی بھر تم میرے لیے روتے رہو گے اور زندگی بھر میں تمھارے لیے روتی رہوں گی ۔ اور ہمارے بہتے ہوئے آنسو سات سمندر بن کر ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیں گے مگر اس دوری کے باوجود مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس خوب صورت اداؤں والی زندگی میں تم خوب صورتی اور محبت اور شفقت کے ہر مہربان موڑ پر مجھے یاد آؤ گے ۔ شام کے جھٹپٹے میں جب میں اپنے پیارے شوہر کو گرم گرم کھانا کھلاؤں گی تو تمھیں یاد کروں گی ۔ اور رات کی تنہائی میں جب اپنے بچے کو سینے سے لگا کر اُسے لوری دوں گی تو تمھیں یاد کروں گی ۔ اور جب سب ختم ہو جائے گا ، جب زندگی کے سارے فرض پورے ہو جائیں گے ، جب موت میری پلکوں کو آخری بار چھونے کے لیے آئے گی اُس وقت بھی میں تمھیں یاد کروں گی ۔ اور میرے آخری سانس میں ، دل کی آخری دھڑکن میں اور ہونٹوں کی آخری جنبش میں تم دعا بن کر

آ جاؤ گے اور میری روح میں سما جاؤ گے !"

"یاد ...... یاد ...... یاد اگر دولت ہوتی تو آج دنیا میں کوئی غریب نہ ہوتا ! محبت کے لیے کوئی ترستا نہ رہتا !" شمشاد نے خود ایک بار مجھ سے کہا تھا ۔ مگر آج میں نے اُسے اپنے آنسو پونچھنے دیے ۔ اُس کے گلے سے لگ کر اُسے پیار کر لیا اور پھر اپنا ہاتھ اُس سے چھڑا کر سٹیشن کی طرف بھاگا کیونکہ گاڑی آؤٹر سگنل کے قریب آ چکی تھی ۔

سٹیشن کی سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے میں نے مڑ کر دیکھا : بڑ کے سایوں میں شاداں چپ چاپ کھڑی تھی اور دور پرے محلاں کی حویلی میں ڈھول گونج رہے تھے اور محلاں سے پرے ہمارا سرکنڈوں کا جنگل جل رہا تھا !

دوسرا باب

لاہور سٹیشن پر پہنچا کر طفیل نے مجھے کہا : "سور دے پتر بد تخمے براہمن اگر شاداں نے مجھ سے قسم نہ لی ہوتی تو میں گاڑی ہی میں تجھے ختم کر دیتا ۔ لے اس کاغذ دے پرزے تے خیریت دی خبر لکھ دے ۔ ہور کچھ نہ لکھنا ۔ نئیں تے گردن اُڑا دیواں گا !"

میں نے ڈرتے ڈرتے شاداں کو پنسل سے لکھا :

شاداں تیرے بھائی نے مجھے لاہور تک
خیریت سے پہنچا دیا ہے ۔ جب تک زندہ
رہوں گا تیرا احسان مانوں گا !

بیج ناتھ

طفیل نے آخری فقرہ پنسل سے کاٹ دیا ۔ "اس کی کیا ضرورت ہے ؟" پھر اُس نے کاغذ تہ کر کے جیب میں ڈالا اور میری طرف دیکھ کر شدید دھمکی آمیز لہجے میں بولا : "لے ، اب بھاگ جا ۔ میری نظر سے دور ہو جا ۔ تجھے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُترتا ہے ۔ کتیا باہمنا !"

میں جلدی سے اُس سے الگ ہو گیا اور سٹیشن سے باہر آ کر تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگے میں بیٹھ کر شاہ عالمی آیا ۔ شاہ عالمی کے دروازے پر تانگے والے نے مجھے اُتار دیا ۔ وہ

شاہ عالمی کے اندر جانے سے انکار کرتا تھا - چنانچہ میں پیدل ہی اندر کو ہو لیا اور سرکی بنداں دی گلی سے ہو کر سوتر منڈی میں اپنے گھر کی طرف چلا - یہاں راستے میں ایک لڑکا کبھی میرے آگے کبھی میرے پیچھے چلنے گا -

میں نے اُس سے کہا : ”میں جو اکیلا یہاں گھوم رہا ہوں میں بھی تیار ہوں - بس اتنا سوچ لینا !“

میری یہ بات سن کر وہ لڑکا رفو چکر ہو گیا اور میں اپنے گھر کی جانب گھوم گیا - گھر پر جا کر دیکھا تو دروازے پر تالا پڑا ہے - گھر میں کوئی نہ تھا - ماں نہ باپ ، بھائی نہ بہن - بیوی بچے سب غائب تھے - اور یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں کیونکہ آس پاس کے سب گھروں پر تالے پڑے تھے - چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا - اب میں جاؤں تو کہاں جاؤں ؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا - ایسی مصیبت میں آنسو بھی نہیں آتے ، بس حلق خشک سا ہونے لگتا ہے - میں نے بڑی مشکل سے اپنے منہ کا لعاب اندر نگلا ، ادھر اُدھر دیکھا اور پھر گلی کی ایک شکستہ موری کا ایک پتھر اُٹھا کے اُس سے گھر کا تالہ توڑ لیا اور اندر داخل ہو گیا -

گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا - سب قیمتی سامان غائب تھا - وہ لوگ کام کا سب سامان لے گئے تھے - میں نے کچن میں جا کے دیکھا - برتن تو تھے مگر کھانے کی کوئی شئے نہ تھی - میں نے نل کھول کر پانی پیا اور پھر اُوپر کی منزل میں ایک چارپائی پر دراز ہو گیا - رات بھر میں اُوپر کی منزل میں کبھی سوتا رہا کبھی جاگتا رہا - رات میں کبھی تو ایسا سناٹا

ہو جاتا جیسے اس شہر کے سارے لوگ مر گئے ہوں ، کبھی ایسی چیخیں سنائی دیتیں جیسے عالمِ نزع میں بکرے چیخا کرتے ہیں ۔ کہیں پر گولیوں کی آواز سنائی دیتی ، چاروں طرف پٹاخے سے چھوٹنے لگتے پھر یکایک قبر کی سی خاموشی چھا جاتی ۔

ایک دن اور ایک رات میں اپنے گھر میں چھپا رہا ۔ آخر جب بھوک نے بہت زور مارا تو پھر باہر نکل کھڑا ہوا ۔ راستے میں کسی نے مزاحمت نہیں کی ۔ چلتے چلتے میں سوتر منڈی سے لوہاری گیٹ ، لوہاری گیٹ سے بھاٹی گیٹ ، بھاٹی گیٹ سے بادشاہی مسجد کی طرف آ گیا ۔ کیوں آ گیا ؟ یہ تو مجھے معلوم نہیں ۔ وہاں سے ہیرا منڈی چلا گیا ۔ ہیرا منڈی میں انور کباب والے سے کباب لے کے کھانے لگا ۔ انور کباب والے نے مجھے پہچان لیا ۔ اُس نے مجھے آنکھ ماری مگر کچھ کہا نہیں کیونکہ دو تین مشتبہ قسم کے مسلمان اُس کی دکان سے کباب لے رہے تھے ۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو اُس نے گھبرا کر مجھ سے کہا :

” پنڈت جی ! آپ یہاں کہاں ؟ خدا کے لیے بھاگ جائیے ! “

” کہاں جاؤں ؟ “ میں نے بڑی مایوسی سے پوچھا ۔

انور نے نا اُمیدی سے سر ہلایا ۔ پھر یکایک اُس کی سمجھ میں کچھ آ گیا ، بولا : ” ارے آپ کے دوست میاں ، حاجی اور برک ، تاجی کے ہاں گانا سن رہے ہیں ۔ آپ وہاں چلے جائیے ۔“

میں نے میاں کا نام سن کر انور سے زور کا مصافحہ کیا ۔ ارے مجھے اس مصیبت میں میاں یاد ہی نہ رہا ! میاں کی اور

میری گاڑھی چھنتی تھی ۔ میاں ، حاجی ، برک اور میں روز رات کو چوکڑی جاتے تھے ۔

میں عقب کی سیڑھیاں اُوپر چڑھ کر دوسری منزل پر تاجی کے کمرے میں داخل ہؤا ۔ اندر حاجی ، برک اور میاں بیٹھے پی رہے تھے اور تاجی ہار سنگھار کیے ، چودھویں کا چاند بنے ، گا رہی تھی ۔ مجھے دیکھ کر اُس کا رنگ فق ہوگیا ۔ حاجی کا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا مگر کمال ہے اور شاباش ہے میاں کے کہ وہ اُٹھ کر میرے گلے سے لپٹ گیا اور برک نے بھی میرا ہات پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا ۔

میاں نے پوچھا : "کہاں سے آ رہے ہو ؟"

میں نے اُسے ساری بپتا کہہ سنائی ۔

تاجی بولی : "آپ پنڈت جی کو یہاں سے لے جائیے ۔ اگر کچھ ہوگیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں ۔"

میاں نے تاجی کے بھائی سے تہمد مانگا اور ایک قراقلی مستعار لی اور مجھے پہنائی ۔ پھر ہم سب لوگ تاجی سے رخصت ہوکر سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئے اور اُترتے ہی میاں کی کار میں بیٹھ گئے ۔ میاں نے تیزی سے اپنی گاڑی چلائی اور بھارت نگر میں مجھے اپنے گھر لے آیا ۔ بھارت نگر میں ریلوے سٹیشن کے قریب ہی میاں کی دو منزلہ کوٹھی تھی ۔

جب میں نے بھابھی کو آداب کیا تو وہ بھونچکی سی رہ گئی ، کچھ بولی ہی نہیں ، چپ چاپ مجھے دیکھنے لگی ؛ جیسے کسی انسان کو نہیں کسی مردے کو دیکھ رہی ہو ۔

غـــدار

مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہؤا کیونکہ دس برس تک میری اور میاں کی میٹل پینٹ کی کمپنی میں حصے داری رہی تھی اور گو اب میں نے اُس سے الگ ہوکر اپنی پبلشنگ کمپنی کھول لی تھی مگر ہم دونوں کے دل کبھی الگ نہ ہوئے تھے اور دونوں گھروں میں سگے عزیزوں اور رشتے داروں کی طرح بیوہار ہوتا تھا اور شادی بیاہ میں ، دکھ سکھ میں سگے عزیزوں کی طرح بھاجیاں تقسیم ہوتی تھیں - اس لیے اس وقت بھابھی کا اُترا ہؤا چہرہ اور پھیکا ، بے مزہ سلوک دیکھ کر میرا دل اندر سے بیٹھ گیا مگر میں نے اپنی مایوسی کو اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیا - پھر میاں جلدی سے مجھے وہاں سے اُوپر کی منزل کے ڈرائنگ روم میں لے گیا - حاجی اور برک بھی ہمارے ساتھ تھے -

اُوپر پہنچ کر میاں نے اطمینان کی سانس لی - میری قراقلی اُتار کے تپائی پر رکھ دی اور سر ہلا کر بولا :

" غضب کر دیا تم نے بیج - ایسے موقعے پر لاہور آئے ہو جب محلے محلے میں آگ اور فساد سے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے - ہندو مسلمان کی جان کا اور مسلمان ہندو کی جان کا پیاسا ہو رہا ہے -"

میں نے میاں سے کہا : " ارے چھوڑو یار - ہمیں ہندو مسلمانوں سے کیا لینا - شراب منگاؤ -"

میاں نے وہسکی کی بوتل کھولی - ہم چاروں بیٹھ کر پینے لگے - ہم چاروں کئی سالوں کے پینے والے تھے - اکٹھے پینے والے تھے - اکٹھے گانا سننے والے تھے - اکٹھے دادِ نشاط دینے

والے تھے مگر آج رنگ ہی نہیں جما ۔ کسی کی ہنسی میں وہ بات ہی نہ تھی ۔ بیچ بیچ میں خاموشی کے ایسے لمبے وقفے آتے تھے کہ دم گھٹنے لگتا تھا ۔ مجھے ہزاروں شعر شاعروں کے یاد تھے اور میرا گلا بھی اچھا تھا مگر آج کسی کو کچھ اچھا ہی نہ لگ رہا تھا ۔ محفل اُکھڑی اُکھڑی سی تھی ۔ کبھی کبھی حاجی مجھے ایسی نگاہوں سے گھورتا کہ مجھے اپنے گلے پر چھری چلتی ہوئی معلوم ہوتی ۔ حاجی میرا بھی بہت یار تھا مگر کبھی کھل کے طبیعت نہیں ملی اُس سے ۔ بیچ میں ہمیشہ ایک دیوار سی تھی ۔ میاں اور برک کے ساتھ میں نے کبھی اس طرح محسوس نہیں کیا ۔ شراب کے دور جب چلتے تھے تو بیچ بیچ میں مجھے حاجی کی طنزیہ مسکراہٹ عجیب طریقے سے پریشان کر دیتی تھی ۔

ہونہہ ! ہو سکتا ہے میرا واہمہ ہو ۔ حاجی میرا برسوں کا دوست ہے ! آج تک کوئی غلط بات اُس نے مجھ سے نہیں کی ۔ مجھے معلوم ہے درپردہ وہ میری اور میاں کی دوستی سے جلتا ہے کیونکہ حاجی بھی میاں کو بہت چاہتا تھا اور برک بھی ۔ لیکن میاں کو تو ساری دنیا چاہتی تھی ۔ اُس کا بے فکرا کھلنڈرا پن ، اُس کی دولت ، اُس کی فیاضی ، اُس کی بے ریا محبت ہر ایک کو میاں سے محبت کرنے پر مجبور کرتی تھیں ۔ لیکن میاں اپنے دوستوں میں صرف مجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا ۔ میاں کے دوسرے دوستوں نے تو اسے قبول کر لیا تھا مگر حاجی کے متعلق مجھے ہمیشہ سے یہی خیال رہا کہ اُس نے دل سے کبھی اس حقیقت کو قبول نہیں کیا ہے ۔

کوئی دس بجے کے قریب حاجی نے اجازت چاہی ۔ میاں نے اُسے رکنے کے لیے کہا مگر وہ اصرار کر کے اُٹھ گیا ۔ برک بیٹھا رہا مگر حاجی کے جانے کے آدھے گھنٹے یا پون گھنٹے کے بعد وہ بھی معذرت کر کے اُٹھ گیا ۔

حاجی اور برک کے چلے جانے کے بعد میں نے ، میاں نے ، بھابھی نے اور اُن کے دو بچوں طارق اور تسنیم نے کھانا کھایا ۔ طارق کی عمر آٹھ سال کی ہے اور تسنیم کی چھ سال کی ۔ دونوں مجھے چاچا کہتے ہیں ۔

کھانا کھانے کے بعد میں دیر تک طارق اور تسنیم کو کہانیاں سناتا رہا ۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب دونوں بچے وہیں کہانیاں سنتے سنتے صوفے پر سو گئے اور ہم لوگ اُنھیں سوتے ہی میں اُٹھا کر اُن کے کمرے میں لے گئے اور اُنویں سلا آئے ۔

اس کے بعد میاں نے اپنی بیوی سے کہا : "آج میں برج کے کمرے میں اُوپر کی منزل میں سوؤں گا ۔"

اُس کی بیوی نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ہم لوگ اُٹھ کر اُوپر کی منزل کے بیڈ روم میں آ گئے ۔ میں جانے کتنی راتوں کا جاگا ہؤا تھا ، بستر پر پڑتے ہی سو گیا ۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہؤا ، کیا نہیں ہؤا ۔ کبھی کبھی خواب کے عالم میں مجھے ایسا محسوس ہؤا جیسے لوگ میاں کا دروازہ پیٹ رہے ہیں ، جیسے لوگوں کا ہجوم میاں کے دروازے پر چلا رہا ہے ، جیسے کوئی کھسر پھسر کر رہا ہے — پھر جیسے کوئی زور زور سے رو رہا ہے ۔

پھر یکایک میری آنکھ کھل گئی -

میں نے دیکھا تو میاں اپنے بستر پر موجود نہ تھا - کمرے میں چاروں طرف خاموشی تھی - کہیں سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی - میں نے غسل خانہ کھول کے دیکھا ، میاں اس میں بھی نہ تھا - میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا تا کہ آہٹ نہ ہو اور ننگے قدموں چل کر کمرے کی باہر کی سیڑھیوں پر پہنچا -

یوں تو چاروں طرف خاموشی تھی مگر رات کے سناٹے میں نیچے کی منزل سے باتوں کی آواز آ رہی تھی -

میں دبے قدموں نیچے اُتر گیا -

میاں اپنی بیوی کے کمرے میں تھا - کمرے کا پٹ تھوڑا سا کھلا تھا - میں دیوار سے لگ کر اُن کی باتیں سننے لگا -

میاں کی بیوی کہہ رہی تھی :

" تمھیں کوئی حق نہیں ہے اُسے یہاں رکھنے کا ! "

" میں کیا اُسے بلانے گیا تھا ؟"

" میں کچھ نہیں جانتی - تم اُسے غنڈوں کے حوالے کر دو -"

" زندگی بھر کی دوستی پر خاک ڈال دوں ! یہ انسانیت ہے ؟ "

" اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے .... " میاں کی بیوی نے چلا کے کہا ، " اور کوئی راستہ نہیں ہے - تم نے اگر اُسے غنڈوں کے حوالے نہ کیا تو میں تمھارا اور اُس کا ، دونوں کا ، خون پی جاؤں گی ! "

میاں کی بیوی نے اپنے لمبے لمبے ناخن ہوا میں لہرائے۔ وہ اُس وقت مجھے ایک چڑیل اور ڈائن معلوم ہوئی۔ اُس نے میاں کو کالر سے پکڑ لیا: ”جاؤ اُسے غنڈوں کے حوالے کر دو۔“

میاں اُس کے بستر سے اُٹھا۔ اُس نے قریب کی ایک دراز کھول کر ایک پستول نکالا اور پستول نکال کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا کہ میں جلدی سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ کے اُوپری منزل میں اپنے کمرے میں آ کے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میاں پستول لیے مجھے مارنے کے لیے میرے سرہانے کھڑا ہے۔

یکایک مجھے سیڑھیوں پر میاں کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

قدم میرے دروازے پر آ کر رک گئے۔

میری سانس حلق میں اٹکنے لگی۔

میاں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھولنے کے بجائے کنجی گھما کر بند کر دیا۔ کمرے میں تاریکی تھی اور میں بجلی جلانا بھی نہ چاہتا تھا۔ میں آہستہ سے اپنے بستر سے اُٹھ کر اکڑوں ہو کر دروازے کی طرف گیا اور پردے کے پیچھے سے ہینڈل گھما کے آہستہ سے دیکھا۔ ہینڈل ہلتا نہ تھا۔ میاں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

اتنے میں میاں نے باہر سے ایک سگریٹ سلگایا اور میں نے اُس کی روشنی میں دیکھا کہ میاں کا چہرہ زرد اور ستا ہؤا ہے

اور اس کے بات میں پستول کانپ رہا ہے ۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کم بخت مجھے اندر بند کر کے خود باہر غنڈوں کا انتظار کر رہا ہے ۔

رات بھر میاں کمرے کے باہر پستول لے کر ٹہلتا رہا ۔ ایک پلک نہیں سویا ۔ رات بھر میں بھی جاگتا رہا ۔ اب آنکھوں میں نیند کیسے آتی ۔ جب صبح کاذب ہوئی تو میاں نے کنجی گھما کے دھیرے سے میرا کمرہ کھولا ۔ میں دبک کر اپنے بستر میں لیٹ گیا ۔ میاں نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا ۔

میں نے کہا : ”کیا ہے میاں ؟“

”اُٹھو ، چلو ۔“

”کہاں ؟“

”تم چلو تو میں بتاتا ہوں ۔“

”ٹھہرو ، منہ ہات تو دھو لوں ۔“

”اس کی ضرورت نہیں ۔“ میاں بولا ، ”دیر ہو جائے گی ۔ فوراً چلو ۔“

میں نے شب خوابی کے کپڑے اُتار کر دوسرے کپڑے پہن لیے اور میاں کے ساتھ ہو لیا ۔

میاں کے ہاتھ میں ابھی تک پستول تھا ۔

ہم دونوں نیچے اُترے تو بھابھی کو میں نے آداب کیا مگر اُنھوں نے میرے آداب کا کوئی جواب تک نہ دیا ۔ میں نے دیکھا بھابھی کی دونوں آنکھیں سوجی ہوئی ہیں !

ٹھر کے دروازے پر میاں کی ہڈ ن کھڑی تھی - کانچ دونوں طرف چڑھے ہوئے تھے - میں اور میاں ساتھ ساتھ گاڑی میں بیٹھے - راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی - میاں کا چہرہ سخت اور خشونت آمیز تھا - اُس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے کسی قسم کی بات کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی -

میاں کی ہڈسن سیدھی ریلوے سٹیشن کی طرف ہو لی -

"ہم کہاں جا رہے ہیں ؟"

"لاہور ریلوے سٹیشن -"

"مگر میں لاہور ریلوے سٹیشن جا کر کیا کروں گا ؟ میں تو اس مصیبت میں تمھارے پاس رہنے کے لیے آیا تھا -"

"مصیبت یہ ہے کہ میں تمھیں اپنے پاس رکھ نہیں سکتا !"

گاڑی سٹیشن کی پورچ میں آ کر رک گئی - میاں مجھے جلدی سے اندر لے گیا اور مجھے تین سو روپے دے کے کہنے لگا :

"اب تم فرسٹ کلاس کے مسافر خانے میں بیٹھو اور مجھے بتا دو تم کہاں جانا چاہتے ہو - میں تمھیں ٹکٹ لا کے دیتا ہوں -"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا -" میں نے چلا کے کہا ، "میں لاہور میں رہوں گا - لاہور — جو میرا وطن ہے -"

"تم نہیں رہ سکتے - وہیں جاؤ جہاں تمھارے ماں باپ ، بھائی بہن ، بیوی بچے گئے ہیں -"

"میرا سب کچھ لاہور ہی میں ہے -" میں نے تقریباً رندھے ہوئے گلے سے کہا ، "میاں ، تمھیں معلوم ہے کہ میں لاہور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - مجھے لاہور سے عشق ہے !"

"عشق میں جدائی بھی تو ہوتی ہے۔" میاں کے چہرے پر ایک خشک مسکراہٹ سی آئی جسے دیکھ کر میں بالکل آگ بگولا ہو گیا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا تم اس قدر کمینے اور رذیل نکلو گے۔" میں نے میاں سے غضبناک لہجے میں کہا، "رات کو میں نے بھابھی کو کہتے سنا تھا کہ بیج ناتھ کو غنڈوں کے حوالے کر دو۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم لوگ اس قدر متعصب ......"

میاں نے مایوسی سے سر ہلایا اور کہنے لگا: "رات کو اگر میں تمھیں غنڈوں کے حوالے کر دیتا تو ایک احمق سے پیچھا چھوٹ جاتا!"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"تمھیں معلوم نہیں ہے۔ رات کو حاجی نے یہاں سے جانے کے بعد غنڈے میرے گھر پر بھیج دیے تھے اور اُنھوں نے آ کر بار بار ہمارا دروازہ پیٹا۔ وہ لوگ مصر تھے کہ میں تمھیں اُن کے حوالے کر دوں۔"

"تم نے پستول چلا دیا ہوتا۔" میں نے کہا۔

"اُن کے پاس بھی پستول تھے۔ اور میں اکیلا تھا اور وہ بیس تھے۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے ایک چال چلی اور میں نے اُن سے کہا کہ میں صبح کو پنڈت کو تمھارے حوالے کر دوں گا — زندہ یا مردہ!"

"وہ مان گئے ؟"

"ہاں ۔ مگر چلتے وقت میرے دونوں بچے اپنے ساتھ لے گئے ۔"

"طارق اور تسنیم ؟" میں نے چلا کر کہا ۔

"ہاں ! بطور یرغمال وہ اُنھیں ساتھ لے گئے ہیں ۔ شاید یہ سوچ کر کہ اگر میں صبح کو تمھیں اُن کے حوالے نہ کروں تو ...."

"نہیں ، نہیں ۔" میں چلایا ۔ اور میں نے میاں کے پاؤں پکڑ لیے ، "مجھے لے چلو ۔" میں نے چلا کے کہا ، "مجھے اُن غنڈوں کے حوالے کر دو !"

میاں کے ہونٹ کانپ رہے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی رو دے گا ۔ تھوڑی دیر چپ رہا ، پھر یکایک وہ اپنے پاؤں چھڑا کر پلٹا اور بھاگتا ہوًا سٹیشن کے باہر جا کر ہڈسن کو تیزی سے چلا کر نظروں سے غائب ہو گیا ۔

میں تھوڑی دور تک اُس کے پیچھے بھاگا مگر جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو پلٹ کر سٹیشن کے اندر آ گیا ۔ کچھ دیر تک پتھر کا بت بنا ایک جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا ۔ اب جاؤں تو کہاں جاؤں ! اور اپنے آپ کو حوالے کروں تو کس کے حوالے کروں ! آخر یہ سوچ سوچ کر ایک بزدل کی طرح اپنے دل کو ڈھارس دے دی کہ وہ غنڈے میاں کے بچوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں گے ! ایسا ظلم تو نہ کریں گے کہ ایک ہندو کی جان کے بدلے دو معصوم مسلمان بچوں کی جان

لے لیں ! حالانکہ اس وحشت کے دور میں سبھی کچھ ممکن ہے ، مگر ....

میں یہی سوچتا ہؤا فرسٹ کلاس کی کینٹین کی طرف مڑ رہا تھا کہ اُدھر سے ایک آدمی آتے ہی مجھ سے زور سے یہ کہتا ہؤا لپٹ گیا :

” ارے پنڈت جی ! تم کہاں ؟ “

میں نے دیکھا تو شاہد تھا ۔ شاہد لاہور سٹیشن پر ٹی ۔ ٹی ۔ تھا اور اپنا پرانا یار تھا ۔ شاہد کی آنکھیں مجھے پہچان کر مسرت سے چمک اُٹھی تھیں مگر میں اس عالم میں اپنا نام سن کر چونک گیا ۔

اس موقعے پر کسی کا کسی کو ہندو نام سے پکارنا گویا موت کو دعوت دینا تھا ۔ میں نے اپنی اُنگلی اپنے ہونٹ پر رکھی اور ادھر اُدھر دیکھ کر کہا : ” شش ــ خدا کا شکر ہے کسی نے سنا نہیں ! “

شاہد شرمندہ ہوگیا : ” ساری ، مجھے خیال نہیں رہا ، دوست ! “

شاہد نے بہت بہت معافی چاہی ۔ مجھے اپنے کیبن میں لے گیا ۔ چائے پلائی ۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا : ” اب تم کہاں جاؤ گے ؟ “

میں نے شاہد سے کہا : ” میں آیا تو تھا اپنے گھر ۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہؤا کہ سب لوگ یہاں سے بھی بھاگ چکے ہیں ۔ کچھ دیر اپنے دوست کے ہاں ٹھہرا اور اُس کے لیے مصیبت

کا باعث بنا - اب سوچتا ہوں گاؤں جاؤں ، شاید میری بیوی بچے وہیں پر ہوں گے -"

"تمھارا گاؤں کہاں ہے ؟" شاہد نے مجھ سے پوچھا -

"کوٹلی سودکاں !"

"کوٹلی سودکاں کہاں ہے ؟"

"کوٹلی سودکاں تحصیل شکرگڑھ میں ہے اور تحصیل شکرگڑھ ضلع گورداس پور میں ہے -"

شاہد نے فوراً کہا : "تو تم براستہ ناروال جاؤ گے - ٹھیک ہے - میں تمھیں ٹکٹ لا دیتا ہوں - تھوڑی دیر میں گاڑی جانے والی ہے -" اُس نے گھڑی دیکھ کر کہا اور ٹکٹ لانے چلا گیا -

گاڑی ناروال کو چلنے لگی تو میرے ذہن میں پنجابی کے دو بول یوں چمک گئے جیسے اندھیری رات میں کسی کی آنسوؤں سے بھری ہوئی دو آنکھیں چمک جائیں :

گڈی آئی ، گڈی آئی

ناروال دی

بڈھڑے دی داڑھی وچ

اگ بال دی !

اور یکایک میری آنکھوں میں آنسو آ گئے - اور یکایک مجھے ایسا محسوس ہؤا جیسے پنجاب ایک بوڑھا ہے ، ایک سفید ریش کسان ہے جس کی داڑھی میں تفرقہ پردازوں نے آگ

لگا دی ہے ۔ پنجاب جل رہا ہے اور اُس کی عزت اور حرمت جل رہی ہے اور وہ سفید ریش بڈھا بے بس اور مجبور ہوکر اپنی جھریوں کی پوٹ میں چھپی ہوئی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہا ہے اور سر ہلا ہلا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا ہے ....

گڈی آئی ، گڈی آئی
نارووال دی
بڈھڑے دی داڑھی وچ
اگ بال دی !

تیسرا باب

نارووال سے ہو کر میں سٹیشن دربار صاحب کرتار پور پر اُتر گیا ۔ سٹیشن دربار صاحب کرتار پور سے کوٹلی سودکاں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے ۔ یہاں سے میں پیدل اپنے گاؤں کو ہو لیا ۔ کپادوں کی فصل کا زمانہ تھا ۔ چاروں طرف ہری بھری کھیتیاں نظر آتی تھیں ۔ ٹاہلیوں کے جھنڈ میں مویشی سر جھکائے بیٹھے تھے یا گھاس چر رہے تھے ۔ دور اُفق کے جھلملاتے ہوئے دھندلکوں میں سورج غروب ہو رہا تھا اور دور کسی جاٹ کا گیت فضا میں گونج رہا تھا ۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے یہ سب کچھ بہت بھلا معلوم ہوتا ۔ مگر میرے کپڑے گندے اور میلے کچیلے تھے اور پھٹے ہوئے تھے ۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور میرے ذہن میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی ۔ اس لیے مجھے کچھ اچھا نہ لگا ۔ یہ سرسبز کھیتیاں ہر موڑ پر مجھے حملہ آوروں کی کمین گاہیں معلوم ہوئیں ۔ مویشیوں کی جھکی جھکی گردنیں مجھے حیران اور اُداس معلوم ہوئیں ۔ جاٹ کے بے فکر نغمے کی تان مجھے دکھ اور درد میں ڈولتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ اور جب میرے سر سے یکایک راج ہنسوں کی ایک ڈار اپنے سپید پر جھلاتے ہوئے گزر گئی تو یکایک میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ تم کدھر جا رہے ہو سفید پروں والے راج ہنسو ؟ ــــ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو ... کسی اجنبی جھیل کے کنارے ،

غـــدار

آدمی کی دنیا سے بہت دور، جہاں نرم نرم پروا چلتی ہے اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی لہریں نیلوفر کی پنکھڑیوں کو چوستی ہیں اور برف کے سپید گالوں کی طرح نازک، مصفا اور حسین راج ہنس اپنی لانبی لانبی مغرور گردنیں اُٹھائے، اپنی محبوباؤں کے ساتھ، جھیل کی سطح پر، پھولوں کے درمیان، تیرتے ہیں - مجھے وہاں لے چلو جہاں شفتالو کی جھکی ہوئی شاخیں سطحِ آب پر اپنے پھول گراتی ہیں اور پانچ رنگوں والے ماہی سار اور سات رنگوں والے سنہولے فضا میں قوس قزح کے رنگ بکھیرتے ہیں - مجھے وہاں لے چلو، میرے دوستو! میں تمھارے بچوں سے کھیلوں گا - لمبی لمبی دریائی گھاس میں لیٹ کر اُن اُونچی اُونچی سرکنڈوں کی سفید کلغیوں کو دیکھا کروں گا جو فضا میں امن کے جھنڈے کی طرح لہراتی ہیں - اور اُن خوابوں کو یاد کروں گا جو انہی سرکنڈوں کے سائے میں کبھی میں نے اور شاداں نے دیکھے تھے! ... مجھے یہاں مت چھوڑ جاؤ، میرے رفیقو! ... آج انسان کی دنیا میں بہت زیادہ اندھیرا ہے - بہت زیادہ ظلم ہے - بہت زیادہ تنگ نظری ہے ... تھوڑا سا اندھیرا تو مجھے بھی گوارا ہے اور تھوڑی سی تنگ نظری تو میری روح میں بھی ہوگی اور تھوڑا سا ظلم تو میں نے بھی کسی کی ذات پر کیا ہوگا مگر اتنا بڑا اندھیرا، اتنا بڑا ظلم، اتنی گہری تنگ نظری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی کہ ایک انسان دوسرے انسان پر عرصۂ حیات تنگ کر دے؟ مجھے اپنے پروں پر بٹھا کے لے چلو راج ہنسو - میں کتنے دنوں سے نہیں سویا ہوں اور نیند میرے انگ انگ میں ڈولتی ہے مگر کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں پاتی

ہے۔ میں تمھارے نرم اور ریشم کی طرح ملائم پروں میں سو جاؤں گا اور نیند کے سرمئی غباروں میں کھو کر اپنے سپنوں کے جزیروں کی طرف نکل جاؤں گا ...

مگر راج ہنسوں کی ڈار ہوائی قینچی کی طرح جھولتی ہوئی، میری اُمیدوں کو کاٹتی ہوئی، فضا میں گم ہوگئی اور میں نیچے زمین پر کھڑا رہ گیا!

کیوں میں نے سوچا تھا کہ یہ راج ہنس ضرور مجھے اپنے پروں پر بٹھا کے کہیں لے جائیں گے؟ بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ مگر انسان کبھی کبھی ایسی نا ممکن الحصول باتیں بھی سوچا کرتا ہے اور اُن کے پورا نہ ہونے پر بھی روتا ہے۔ میں نے دو آنسو جھٹک دیے اور اپنے گاؤں کوٹلی سودکاں کی طرف روانہ ہوگیا۔

کوٹلی سودکاں میں میرے دادا جی کا گھر تھا۔ یہاں پر مجھے میرے بھائی بہن، ماں باپ، بیوی بچے سب مل گئے اور ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر وقتی خوشی سے رونے لگے کیونکہ ان سب لوگوں نے سوچ لیا تھا کہ بیج ناتھ لاہور میں مارا گیا ہوگا۔ میرے دادا جی نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ بڑے وجیہہ، پروقار اور پرانے زمانے کے زمیندار تھے۔ اُن کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہؤا تھا اور وہ اپنے سفید بالوں والے سر اور مضبوط ٹھوڑی اور سفید گل مونچھوں سے بڑے بارعب دکھائی دیتے تھے۔ سارے گاؤں پر اُن کا دبدبہ تھا۔ اور چونکہ وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے اس لیے سب لوگ اُن کی بات مانتے تھے۔ تحصیلدار اور تھانیدار اور دوسرے

حاکم آتے تھے اور چلے جاتے تھے مگر گاؤں پر ہمارے دادا جی کی حکومت ہمیشہ قائم رہتی تھی -

میں نے دادا جی کو اور گھر کے دوسرے لوگوں کو لاہور کا سارا حال کہہ سنایا ! اور اُن کو سمجھایا کہ اب گزر ممکن نہیں ہے - اب یہاں سے چلنا ہوگا - اور ابھی تو خیریت ہے - ابھی یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہے ورنہ بعد میں ....

مگر دادا جی بڑے ضدی تھے - برافروختہ ہو کے بولے :
"کیا بات کرتے ہو ؟ بیج ناتھ ؟ اگر اس دھرتی پر پاکستان بنے گا تو کیا ہؤا - ہم اسی دھرتی پر رہیں گے اور اسی کا جس گائیں گے - جیسا سات پیڑھیوں سے کرتے چلے آئے ہیں -"

"مصیبت یہ ہے"، میں نے کہا ، "آپ تو سات پیڑھیوں سے آرام کرتے اور جس گاتے آئے ہیں مگر آپ کے مسلم مزارعے فریاد کرتے آئے ہیں اور اب بدلہ چکانے کا وقت آ گیا ہے !"

"میرے مسلمان مزارعے تو میرے بچے ہیں !" دادا جی فخر سے بولے -

"صرف فصل کاٹنے تک !" میں نے جواب دیا اور دادا جی لاٹھی لے کر مجھے مارنے کو دوڑے ! وہ تو میرے پتا جی اور میرے بڑے بھائی نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ پرانے دستور کے مطابق میں آج بھی پٹتا !

دوسرے دن سہ پہر میں دادا جی دالان کے ایک تخت پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے - کریم خاں اُن کے پاؤں دبا رہا تھا اور اللہ داد اُن کی کمر اور فضلو اُن کے سر میں مالش

کر رہا تھا ۔ مجھے اُدھر سے گزرتے دیکھ کر اُنہوں نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور پھر فضلو سے پوچھا : ”کیوں فضلو ! کیا یہاں بھی فساد ہوگا ؟“

فضلو نے دادا جی کی چمپی کرتے ہوئے کہا : ”مالک ! سات پیڑھیوں سے تو اس گاؤں میں آج تک فساد ہؤا نہیں ہے اور نہ ہوگا ...“

”تم اللہ داد ؟“

اللہ داد نے دادا کی کمر میں مہین مہین چٹکیاں لیتے ہوئے کہا : ”ہم تو آپ کے بچے ہیں مالک !“

”کریم خاں ؟“

کریما پاؤں دباتے دباتے مسکرا کر بولا : ”بے فکر رہیے ! جو فساد کرے گا ہم اُس کی گردن مار دیں گے !“

دادا جی نے فخر سے میری طرف دیکھا ۔ اب میں کیا کہتا ۔ کندھے جھٹکا کر وہاں سے الگ ہوگیا ۔

آٹھ دس روز بڑے آرام سے گزرے ۔ میں اپنے دل کے وسوسے اور واہمے تقریباً بھول گیا ۔ ہم لوگ صبح کو تازہ چھاچھ پیتے ، دوپہر میں کماد کاٹ کر چوستے ۔ سہ پہر میں جب کام سے ذرا فراغت ہوتی تو شہتوتوں والے تالاب کے کنارے درختوں کے گھنے سایوں میں میں اپنے دادا جی کے مزارعوں کے ساتھ تاش کھیلتا ۔ میرا سب سے چھوٹا بچہ منا میری گود میں ہوتا اور غو غاں کر کے میری گود میں کھیلتا رہتا یا تاش کے پتے اُٹھا

کر اپنے منہ میں ٹھونسنے لگتا اور رال ٹپکا ٹپکا کر میری قمیص
گیلی کر دیتا ۔ مگر وہ بڑا گول مٹول گل گوتھلا سا تھا اور
مجھے بہت پیارا معلوم ہوتا تھا ۔ جب میری گود میں بیٹھتا
تھا اور میں اُسے گود میں لے کر شہتوت کے گھنے سایوں میں
دادا جی کے مزارعوں کے ساتھ تاش کھیلتا تو مجھے زندگی
نیلے آسمان میں تیرتے ہوئے سپید اور ہلکے پھلکے بادلوں کی طرح
نرم اور آہستہ خرام معلوم ہوتی تھی !

اکیس اگست کی شام میں ، جب چولھوں پر مکئی کی روٹیاں
سینکی جا رہی تھیں اور آنگن میں کڑھی کی خوشبو چاروں طرف
پھیلی ہوئی تھی اور بچھڑے کھونٹے سے بندھے اپنی ماؤں کو
آواز دے رہے تھے اور گھاگھرا جھلاتی ہوئی جوان اور مہوش
بھوئیں اپنے اپنے خاوندوں کے لیے تھالیاں پروس کر لے جا رہی
تھیں ، اُس سمے دالان میں دادا جی کے مزارعوں کا ایک وفد
تخت کے پاس آ کے رکا ۔ اُن لوگوں نے فریادیوں کی طرح چادریں
اُلٹی کر کے اپنے گلے میں ڈال رکھی تھیں اور اُن کے سر خوف
اور شرم سے جھکے ہوئے تھے ۔

دادا جی کھانا کھانے والے تھے کہ انھوں نے ان لوگوں
کو آتے دیکھ کر تھالی ہٹوا دی اور ذرا کڑی آواز میں بولے :
"کیا ہے ؟"

مزارعوں کے وفد میں کریم خاں تھا ، اللہ داد بھی تھا اور
فضلو بھی تھا ، رحمان بھی تھا اور دوسرے لوگ بھی تھے جنھیں
میں زیادہ اچھی طرح سے نہیں جانتا تھا ۔

کریم خاں نے چادر کا پلو اپنے ہات میں لے کر اور جھک کر کہا : "مالک اُوپر سے حکم آیا ہے لوٹ لو۔"

"اُوپر والا تو خدا ہے۔" دادا تضحیک سے ہنسے۔

"کیا خدا نے تمھیں ہمیں لوٹنے کے لیے کہا ہے!"

وہ لوگ دو ایک لمحوں کے لیے تذبذب میں پڑ گئے، پھر فضلو آہستہ سے بولا : "مالک آپ چلے جائیں یہاں سے!"

"کیوں چلا جاؤں؟" دادا غصے سے چیخے!

کریم خاں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا : "مالک! اُوپر سے حکم آیا ہے لوٹ لو۔ ہم اُوپر والوں کا حکم ٹال نہیں سکتے۔"

یہ کہہ کر کریم خاں نے سر جھکا لیا اور ٹپ ٹپ کرتے ہوئے آنسو اُس کی میلی چادر پر گرنے لگے۔

دادا نے غصے سے کہا : "تم نہایت بزدل اور احمق ہو جو غنڈوں سے ڈر جاتے ہو۔ میرے پاس چھ بور والا ریوالور ہے۔ ایک تھری ناٹ تھری ہے۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال کوٹلی سودکاں کے زمیندار کو لوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ چلے جاؤ۔"

اُن لوگوں کے جانے کے بعد میں نے اور میرے پتا جی نے بھی دادا جی کو بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح نہیں مانے۔ کسی طرح اُن کے دل میں یہ بات نہیں گھستی تھی کہ اب اُن کو یہاں سے جانا ہوگا۔

گھر میں دو پارٹیاں ہو گئیں ۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ جانا چاہیے ۔ کچھ لوگ دادا جی کے حمایتی تھے ، وہ کہتے تھے کہ یہ سب خون خرابہ ، فساد چند دنوں کا اُبال ہے ، ٹھنڈا پڑ جائے گا ۔ پھر ہم لوگ جانے والوں سے کہیں زیادہ آرام میں رہیں گے اور کوٹلی سودکاں میں تو کبھی کچھ ہو ہی نہیں سکتا ۔ چچا آیا رام اور تایا رام لبھایا تو دادا جی کے حق میں تھے مگر میں اور میرا بڑا بھائی اور پتا جی جانے کے حق میں تھے ۔ اور جو مرد جس طرف تھا اُسی طرف اُس کی بیوی اور بچے بھی تھے ۔ آدھی رات اسی بحث میں کٹ گئی ۔ اُس کے بعد سب پڑ کے سو گئے ۔

لیکن صبح کو حملہ ہو گیا ۔ ابھی ہم لوگ ٹھیک طرح سے جاگے بھی نہ تھے ۔ بچے بالے تو سو رہے تھے ۔ میں خود رات کا جاگا ہؤا دیر سے سویا تھا اس لیے جب گلی میں ڈھول بجنے لگے ، فسادیوں کے نعرے بلند ہونے لگے اور عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سنائی دی تو میں ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا ۔ میں ایک بنیان اور تہمد پہن کر سویا تھا ۔ اُسی لباس میں اُٹھ کھڑا ہؤا اور گھبرا کر میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی ۔ میرے کمرے کی کھڑکی باہر کپادوں کے کھیت کی طرف کھلتی تھی ۔ میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کے پہلے تو کپادوں کے اندر ہی اندر دور تک دوڑتا چلا گیا ۔ اور کپادوں کے تیز دھار والے پتوں نے میری بنیان اور تہمد کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا اور میری ٹانگوں اور بازوؤں پر بھی کئی جگہ سے خون نکل آیا اور کئی جگہ پر سرخ خراشوں کے نشان پڑ گئے ۔ آخر

غـــدار

جب ڈھولوں ، نعروں اور چیخوں کی آواز دور ہوگئی اور دب سی گئی تو میں لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے رکا اور وحشت سے آنکھیں پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا ...

یہاں کوئی بھی نہ تھا ۔ چاروں طرف کپاد ہی کپاد تھے اور وہ جو دور کا شور تھا وہ بھی گویا دبتا سا جا رہا تھا ۔ کوئی آدھے پونے گھنٹے کے بعد چاروں طرف خاموشی چھا گئی ۔ ڈھولوں کی آواز ، دوڑنے والے قدموں کی آہٹیں ، تکبیر کے نعروں میں گھلی ہوئی ، ڈری ہوئی چیخیں سب ساکت ہو کے رہ گئیں ۔ اب میرے چاروں طرف خاموشی کی ایک چادر سی تن گئی تھی ۔

میں دبک کے کھیت میں بیٹھ گیا ۔ ایک دن اور ایک رات اور دوسرا دن اور دوسری رات اور تیسرے دن کی سہ پہر تک میں وہیں کھیت میں چھپا رہا ۔ ڈر کے مارے حرکت تک نہ کرتا تھا ۔ مبادا میری آہٹ سے وہ لوگ خبردار ہو جائیں اور مجھے پکڑ کر ہلاک کر ڈالیں ۔ دوسری رات زور کی بارش ہوئی اور کھیت کے کیچڑ سے میرا سارا جسم غلیظ ہوگیا مگر ایک اچھی بات بھی ہوئی ۔ میں سخت پیاسا تھا اس لیے بارش کے بھیگے ہوئے پتوں کو چاٹتا رہا اور کپاد کے ڈنٹھلوں میں رکے ہوئے پانی کو پیتا رہا ۔ اس سے پیاس تو بجھ گئی مگر بھوک چمک اُٹھی ۔ تیسرے روز سہ پہر میں تو اس قدر زور کی بھوک لگی کہ جس نے میرے ڈر کو بھی ختم کر دیا اور میں بھوک سے بالکل مجبور اور بے بس ہوکر کھیتوں سے باہر نکل آیا اور پیدل پیدل چل کر اپنے دادا کے گھر تک پہنچ گیا ۔

غــدار

میرا دادا دہلیز پر مرا پڑا تھا ۔ اُس کا جسم پھول گیا تھا اور اُس کا ایک ہات دہلیز کے باہر تھا اور ایک ہات دہلیز کے اندر تھا ۔ اور دہلیز کے باہر ہمارے گھر کی کتیا رومی کان لٹکائے دادا جی کی لاش کے قریب بے حس و حرکت بیٹھی تھی ۔ میں دادا جی کے اُوپر سے چھلانگ لگا کے گھر کے اندر چلا گیا ۔ آنگن میں جا کے سب سے پہلے نل کھول کے پانی پیا ۔ اور جب پانی پی کر سیر ہوگیا تو رسوئی میں چلا گیا اور کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈنے لگا ۔ اتفاق سے چنگیر میں میلے کپڑے میں لپٹی ہوئی مجھے چند روٹیاں مل گئیں اور چھکے میں مکھن بھی مل گیا اور کونے میں پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی گڑوہلی میں تھوڑا سا گڑ بھی مل گیا ۔ میں کھانا کھاتے ہوئے رسوئی سے باہر آ گیا اور آنگن میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ غربی دیوار سے لگے ہوئے تخت کی چادر سرکی ہوئی تھی اور آدھی نیچے لٹک رہی تھی اور اسی تخت پوش پر دادا کے خون کے چھینٹے تھے ۔ حقے کی نے الگ تھی ۔ نیچہ الگ زمین پر پڑا تھا ۔ قریب میں دو کھٹولے اور پیڑھیاں اوندھی پڑی تھیں ۔ میں نے وہاں سے نظر ہٹا لی اور جنوبی دیوارکو دیکھا جہاں لوکی کی بیل میں سبز سبز لوکی کے پھل لٹک رہے تھے ۔ کونے پر تنور اُسی طرح کھڑا تھا اور اُس کے نیچے ایک لوہے کا چمٹا پڑا تھا ۔ میری نظر مشرقی دیوار کی طرف گھوم گئی ۔ دیوار سے ایک چارپائی لگی کھڑی تھی اور اُس پر ازار بند بُننے کے لیے ریشمی دھاگوں کا اڈہ ابھی تک کھڑا تھا ۔ اور یکایک میری نگاہوں میں میرے چھوٹے بھائی کی دلہن آشا کا چہرہ گھوم گیا : شرمیلا ، سانولا

چہرہ - ماتھے پر بندی ، ناک میں سونے کی چمکتی ہوئی کیل - پتلے پتلے ہونٹ ، حیا اور شرم سے مسکراتے ہوئے اور حنائی اُنگلیاں ریشم کے لچھوں کو سلجھاتی ہوئیں ، رنگین ڈوریوں میں روزمرہ کی زندگی کے خواب بنتی ہوئیں - اس وقت وہ حنائی اُنگلیاں کہاں ہیں ؟ یہ گھر کی دیوار سے لگی ریشم کی تصویر شاید اب کبھی مکمل نہ ہو سکے گی ! اور یکایک میرے چاروں طرف میرا گھر بھر گیا : پرانی آوازوں سے ، پرانی خوشبوؤں سے ، جانے پہچانے چہروں سے - اور ایک لمحے کے لیے میں نے بالکل یہ محسوس کیا جیسے وہ میری ماں آٹا گوندھ رہی ہے - وہ میری بیوی آٹے کے پیڑے پکا رہی ہے - وہ میرا بچہ منا آٹے کے بیل بکری بنا رہا ہے - دادا تخت پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور مشرق دیوار سے لگی ریشمی اڈے پر میرے بھائی کی دلہن ازار بند بن رہی ہے اور زیر لب گنگنا رہی ہے :

گڈی آئی ، گڈی آئی سپاہی والی

ایہنوں ٹکٹ نہ دئیں بابو

ساہڈی رات جدائی والی !

دوسرے لمحے میں وہاں کچھ نہ تھا - تخت پوش خون کے سیاہ دھبوں سے بھرا تھا - نیچہ اُلٹا پڑا تھا - کھٹولے اوندھے پڑے تھے اور دیوار سے لگی اُلٹی چارپائی پر ریشم کا اڈہ نا مکمل تھا ...

روٹی کھاتے کھاتے میں نے یہ سب کچھ سوچا اور دیکھا - اتنے میں میں نے دیکھا کہ رومی میرے قدموں میں آ گئی ہے

اور میری طرف عجیب بے کسی اور بے بسی کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے - روسی حاملہ تھی اور اُس کا پیٹ اُبھرا ہؤا اور کچھ لٹکا ہؤا تھا - چند دنوں میں ، پندرہ بیس روز یا شاید مہینے کے بعد ، یہ بچے دے گی -

دادا اس سے کتنا پیار کرتے تھے - بے چاری یہ بھی تو تین دن کی بھوکی ہو گی ، میری طرح - میں نے روسی کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا پھینکا - روسی نے نہیں کھایا - میں نے دوسرا ٹکڑا توڑ کر پھینکا - روسی نے اُسے بھی سونگھ کر چھوڑ دیا - نہیں کھاتی تو نہ کھا ، بھوکی مر - میں نے دونوں ٹکڑے بھی اُٹھا لیے اور آستین سے جھاڑ کر دوسری روٹیوں کے ساتھ اُسی سیلے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے ساتھ رکھ لیے - جانے کتنے دن بھوکا رہنا پڑے !

روٹی کھا کر میں نے پھر پانی پیا - پھر آنگن سے گھر کی دہلیز تک آیا - دادا کی لاش پر سے چھلانگ لگا کر پیچھے پیچھے کھیتوں کے کنارے چلنے لگا - یکایک مجھے آہٹ سی محسوس ہوئی - میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا - روسی بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی -

تو کہاں جائے گی کتیا - تو حاملہ ہے ، تو گابھن ہے - تو کتیا ہے ، تجھے کوئی ڈر نہیں ہے - تو انسان تھوڑی ہے کہ تجھے اپنی جان کا ڈر ہو - یہ تو سب تہذیب کی باتیں ہیں - اُونچے مذہب اور اخلاق کے جھگڑے ہیں - یہ تلوار تو بہت بلند اصولوں کی حمایت میں نکلی ہے - شکر کر کہ تیرا گلا اس

سے کاٹا نہ جائے گا ۔ شکر کر تو غیر مہذب ہے ، جاہل اور
بے اخلاق ہے ۔ شکر کر کہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ مذہب کیا
ہے ۔ تو نے کبھی سندھیا نہیں کی ۔ کبھی پانچ وقت نماز نہیں
پڑھی ۔ تو کبھی کسی گرجے ، مندر ، مسجد نہیں گئی ۔ تو نے
کبھی آزادی کا مفہوم نہیں سمجھا ۔ کبھی کسی سیاسی لیڈر کی
تقریر نہیں سنی ۔ شکر کر کہ تو کتیا ہے ، انسان نہیں ہے ۔

بھاگ جا ، میرے پیچھے ست آ ۔ کیونکہ میں ایک انسان
ہوں اور اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے انسان سے بھاگ رہا
ہوں ۔ بھاگ جا اور چلی جا واپس اپنے گاؤں میں ۔ جہاں میں
رہتا تھا اور جہاں تو رہتی تھی ۔ جہاں میں پیدا ہؤا اور تو
پیدا ہوئی ۔ جہاں سے مجھے نکال دیا گیا ہے مگر تجھے کوئی
بات نہیں لگائے گا کیونکہ تو ایک کتیا ہے ، انسان نہیں ۔

چلی جا اُسی گھر میں ! وہ گھر سدا اسی طرح ویران اور
برباد تو نہ رہے گا ؟ کوئی تو آئے گا اُس گھر میں ۔ اور کوئی
تو اُس حقے کے نیچے کو اُٹھا لے گا اور اُسے دامن سے جھاڑ پونچھ
کر اپنے گلے سے لگا لے گا اور فرشی میں تازہ پانی ڈال کے چلم
کی گی پر تمباکو کو جما کر انگارے رکھے گا اور اسی تخت پوش
پر بیٹھ کر حقہ پیے گا ۔ اور اُس ریشمی اڈے میں پھر سے کسی
شرمیلی اور معصوم بہو کی حنائی انگلیاں گھومیں گی اور اُسیدوں
کی وہی تصویر بنائیں گی جو میرے چھوٹے بھائی کی دلہن نے
نا مکمل چھوڑ دی تھی ۔ وہ گھر پھر چہکے گا ۔ تنور میں آگ
بھڑکے گی ۔ چنگیر سے گرم گرم روٹیوں کی سوندھی سوندھی

غــدار

خوشبو آئے گی اور لوکی کی سبز بیلوں سے ڈھکا ہؤا آنگن نوخیز کنواریوں کے گیتوں سے بھر جائے گا اور کوئی سعیدہ اور کوئی جمیلہ ککلی ڈالتے ہوئے کہے گی اور قہقہہ مار کر ہنس پڑے گی :

ککک لک لیر دی
پگ میرے ویر دی
دوپٹہ میرے بھائی دا
پھٹے منہہ جوائی دا

ہاں ! نئی زندگی آئے گی اور پرانے ظلم کو دھو دے گی !

اس لیے تو واپس چلی جا — روسی !

مگر روسی واپس نہیں گئی ۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی آ رہی تھی : گردن جھکائے ، کان لٹکائے ۔

بے وقوف ، احمق کتیا !

چوتھا باب

یہاں پر یہ ضروری ہے کہ میں آپ کو اپنی مشکل کا حدود اربعہ سمجھا دوں ۔ سٹیشن دربار صاحب کرتار پور سے ڈیڑھ میل ادھر ہمارا گاؤں تھا ، کوٹلی سودکاں ۔ ڈھائی میل اُدھر کنجروڑ کا قصبہ تھا ۔ بیچ میں ریلوے لائن تھی جو نارووال کو جاتی تھی ۔ میں چونکہ نارووال سے آیا تھا اس لیے واپس اُدھر نہ جانا چاہتا تھا ۔ بچاؤ کا راستہ ایک ہی تھا کہ کسی طرح گوردوارہ کرتار صاحب پہنچ جاؤں اور وہاں سے بریتے بریتے ہو کر دریائے راوی کے کنارے پہنچ جاؤں ۔ اُس مقام پر جس کے پار ڈیرہ بابا نانک کا قصبہ اور بیچ میں راوی کا پل تھا جو پاکستان کی سرحد کو ہندوستان کی سرحد سے جدا کرتا تھا ۔

جس طرح میں سوچ رہا تھا عین اُسی وقت کنجروڑ سے اور کنجروڑ کے دیہات سے آنے والے ہندوؤں کے قافلے بھی اسی طرح سوچ رہے تھے ۔ وہ بھی سٹیشن دربار صاحب کرتار پور کو کراس کر کے ایک سڑک پر چل رہے تھے جو ڈیرہ بابا نانک کے پل کو جاتی ہے ۔

یہ قافلہ کوئی تیس چالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہوگا ۔

میں اکیلا تھا اور یوں بھی میں ایک ڈرپوک ، بزدل انسان ہوں ۔ زندگی بھر کبھی مار پیٹ نہیں کی ۔ کبھی کسی سے زیادہ

جھگڑا نہیں کیا ۔ کوئی خاص دکھ بھی نہیں اُٹھائے ۔ زندگی
اب تک بڑے عیش و آرام میں گزری تھی اس لیے کسی سے
شدید نفرت کرنے کا موقع بھی آج تک نہیں ملا تھا ۔ جدید
تعلیم نے اتنا تو کر دیا تھا کہ میرے دل سے اُونچ نیچ ،
جات پات ، مذہب ، رنگ اور نسل کے اختلاف مٹا دیے تھے ۔
یہ باتیں مجھے کچھ — بس کچھ اچھی نہیں لگتی تھیں ۔ ان سے
باسی دہی کی سی کھٹاس کی بو آتی تھی اور جی یہ چاہتا تھا
کہ جہاں کہیں بھی یہ چیزیں ملیں انہیں جلدی سے اُٹھا کے
کسی گندی موری میں بہا دیا جائے ۔ میرے دوستوں میں ہندو ،
سکھ ، مسلمان ، عیسائی ، یہودی ، انگریز سبھی طرح کے لوگ
تھے جیسے کسی کھاتے پیتے بزنس مین کے ہو جاتے ہیں ۔
مگر میرا سلوک اُن سب سے اچھا اور اُن کا سلوک مجھ سے
بھی اچھا تھا اس لیے میں کبھی اُن کے دل میں زیادہ گہرا
نہ اُترا تھا ۔ اور اگر یہ کہوں کہ آج تک میں خود کبھی اپنے
دل میں زیادہ گہرا نہ اُترا تھا تو یہ بھی غلط نہ ہوگا ! شاید
حالات نے ، آسودگی نے ، میرے بے پروا لا اُبالی مزاج نے
کبھی اس کی فرصت ہی نہیں دی ۔ اور فرصت تو اب بھی مجھے
نہیں تھی ۔ اس وقت میں اکیلا تھا اور جنگل میں ایک نہتے
جانور کی طرح اپنی جان بچانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اور اپنے
آپ کو بے حد اناڑی پا رہا تھا ۔ جنگل سے ناطہ تو کئی ہزار
برس سے چھوٹ چکا تھا اور تہذیب کی پتلی جھلی کو میں نے
کبھی کرید کر نہ دیکھا تھا ۔ آج یہ جھلی اتفاق سے ، حادثات
سے ، تاریخ کے وار سے پھٹ گئی تھی اور اندر سے جنگل نکل آیا

تھا اور میں اسے دیکھ کر سراسیمہ ہوگیا تھا ۔ میں انسانی
آبادیوں میں پلا ہؤا ، انسانی تہذیب کو مستقل اور دائم سمجھنے
والا انسان آج یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس جنگل میں کیسے
رہوں جس میں مجھے جانے کتنے دن ، کتنے مہینے رہنا پڑے ۔
کماد کے کھیت دشمنوں کی کمین گاہ نظر آتے تھے ؛ ہر ٹیلے کی
اوٹ میں ، ہر نشیب کی بستی میں مجھے موت نظر آتی تھی ؛
ریلوے سٹیشن پر بھیڑیے تاک میں تھے اور یہ ریل کی پٹری ، جو
یہاں سے نارووال جاتی ہے اور نارووال سے لاہور جاتی ہے ، جو
میرے ذہن میں ہمیشہ سے بیسویں صدی کی تہذیب اور حفاظت
کی علامت رہی ہے ، آج موت کا بوجھ ڈھو رہی ہے ۔ اور جب
میں پیچھے پیچھے چلتا ہؤا راستہ بھول گیا ، کمادوں میں سے گزر کر
گوردوارہ کرتار صاحب کی طرف جانے کے بجائے سٹیشن دربار
صاحب کرتار پور کی جانب آ نکلا تو میں نے کمادوں کی اوٹ
میں سے چھپ کر دیکھا کہ ٹیلوں کے پیچھے ، بیریوں کے
جھنڈوں میں اور کماد کے کھیتوں میں ، بالکل میرے سامنے ،
بہت سے مسلمان فسادی منہ پر ڈھاٹے باندھے ، ہاتھ میں بلم ،
چھریاں ، گنڈاسے ، بندوقیں لیے کھڑے ہیں اور کمادوں کے اس
پار ، ریلوے لائن کی دوسری طرف ، سڑک پر سے کنجروڑ کی جانب
سے آنے والے ہندوؤں کے قافلے کو دیکھ رہے ہیں ۔ وہ مجھے نہ
دیکھ سکتے تھے کیونکہ اُن کی پیٹھ میری طرف تھی اور میں
اُن کے پیچھے کے کمادوں کے کھیت میں دبکا ہؤا تھا لیکن
میں اُنھیں صاف دیکھ سکتا تھا اور وہ پیٹھ سے پیٹھ جوڑے ،
بلم تانے ، شکاریوں کی طرح یوں چوکس اور ہشیار کھڑے تھے

کہ اُنھیں دیکھ کر یکایک مجھے احساس ہؤا جیسے میں کوئی انسان نہیں ہوں خرگوش ہوں ، گیدڑ ہوں ، لومڑی ہوں ؛ چاروں طرف ایک تاریک گھنا جنگل ہے اور سبز سبز پتوں میں چھپی ہوئی بے رحم ، لال لال آنکھیں اور لانبے لانبے ، تیز تیز ، چھری کی دھار والے ناخن میرے گوشت میں گڑ جانے کے لیے تیار ہیں -

پہلی بار مجھے زندگی میں اک عجیب سا احساس ہؤا اور میں کچھ سوچنے لگا حالانکہ موت سامنے کھڑی تھی - کبھی کبھی دماغ دو دو تین تین متوازی سطحوں پر کام کرتا ہے - میں کھیت میں دبکا پڑا ہوں - میرے سامنے کے کپاد کے کھیت میں اور بیریوں کے جھنڈ میں اور ریلوے لائن کے ادھر کی جھاڑیوں میں حملہ آور گھات لگائے تیار ہیں اور پار سڑک پر قافلہ گزر رہا ہے : بڈھے ، بچے ، عورتیں ، جوان ؛ ہندو ، سکھ ، کھتری ، باہمن ، چمار ، چوہڑے ، راجپوت ، تیلی ، زمیندار ، مہاجن سب گزر رہے ہیں - کبھی یہ سب لوگ آپس میں لڑتے تھے ، ایک دوسرے سے بے ایمانی کرتے تھے ، ایک دوسرے کا استیصال کرتے تھے ، ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے مگر آج سب لوگ سر جھکائے اکٹھے بھاگ رہے تھے اور مجھے یاد آیا کہ جب جنگل میں کوئی بہت بڑی آفت آتی ہے ــ سیلاب یا طوفان یا آگ ــ تو اُس وقت سارے جانور اکٹھے ہو کر بھاگتے ہیں ــ ہرن اور شیر اور بھالو اور ہاتھی اور چیتے اور نیل گائے اور سانپ اور گیدڑ اور خرگوش ــ اور اُس مصیبت کے لمحے کوئی کسی پر حملہ نہیں کرتا ، کوئی کسی کا حق نہیں مارتا ، سب ایک

مشترکہ خطرے سے بچنے کے لیے ایک مشترکہ مصیبت کے سامنے اکٹھے ہو کر چلے جاتے ہیں ، چلے جاتے ہیں ، چلے جاتے ہیں — جنگل کے جانوروں کی طرح ! سڑک مجھے اس وقت بالکل جنگل کی ایک پگڈنڈی سی معلوم ہو رہی تھی جس پر ہزاروں جانوروں کے غول کے غول ہراساں اور سراسیمہ تیز تیز قدموں سے جان بچانے کے لیے دوڑتے چلے جا رہے تھے ....

جب تین چوتھائی قافلہ گزر گیا تو کمادوں میں دبکے ہوئے مسلمان فسادیوں کے ایک سرغنے نے ایک اشارہ سا کیا اور وہ اشارہ پاتے ہی تکبیر کے بلند بانگ نعروں کے ساتھ چھریاں ، بلم ، گنڈاسے اور تلواریں اور لاٹھیاں برساتے ہوئے قافلے پر حملہ آور ہو گئے ....

قافلے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی - جس کے جدھر سینگ سمائے اُدھر اپنی جان لے کے بھاگا - مدافعت کا یہاں کس کو ہوش تھا ، مدافعت کی ساری اُمیدیں اُن کے دل سے نکل چکی تھیں - اب تو وہ اک اتفاق پر تکیہ لگائے ، اک اُمید پر جیتے ہوئے چل رہے تھے کہ کسی طرح راوی کے پل تک پہنچ جائیں ورنہ اخلاق طور پر اُن میں سے ہر شخص مرا ہؤا تھا -

اس لیے سینکڑوں آدمی آدھے گھنٹے میں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیے گئے اور پھر حملہ آوروں کا ہجوم اپنا کام کر کے کسی دوسری سمت کو چل دیا -

میں نے سوچا کہ قافلے کے ساتھ شامل ہو کے چلنا اور بھی حماقت ہوگی - اگر جان بچی تو اکیلے ہی میں کسی طرح

بچ جائے گی ، ورنہ موت تو یقینی ہے ۔

یہ سوچ کر میں نے کسی قافلے میں شامل ہونے کا خیال ترک کر دیا اور شام کے جھٹپٹے تک وہیں کہادوں میں دبکا بیٹھا رہا ۔

شام تک مجھے شدید پیاس محسوس ہونے لگی ، حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے ، اب کسی طرح لعاب حلق سے نیچے نہیں اُترتا تھا اور تالو ہی سے چپک کر خشک ہو جاتا تھا ۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب حلق میں کسی طرح کا لعاب نہ رہا اور میں نے گھبرا کر سٹیشن دربار صاحب کرتار پور جانے کی ٹھانی ۔ وہاں تو پانی ضرور مل جائے گا ۔ ایک دفعہ پانی پی لوں بعد میں بلا سے کوئی چاہے جان سے مار ڈالے !

یہ سوچ کر میں کہادوں سے نکلا اور ریل کی پٹری کے کنارے کے نشیبوں میں سے چھپتا چھپاتا سٹیشن دربار صاحب کرتار پور پہنچ گیا ۔

آج سٹیشن پر اندھیرا تھا ۔ دروازے پر ٹکٹ کا بابو نہ تھا ۔ پلیٹ فارم پر بتیاں جلی نہ تھیں ۔ سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں سٹیشن ماسٹر مرا پڑا تھا ۔ باہر پلیٹ فارم پر چاروں طرف ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں عجیب بے ترتیبی کی حالت میں پڑی تھیں ۔ میں ان سب مناظر کو ایک چھچھاتی ہوئی نگاہ سے دیکھتا ہؤا سیدھا ہندو پانی کی طرف گیا اور پیٹ بھر کر پانی پیا ۔ لیکن اس دوران میں میں بالکل چوروں کی طرح سٹیشن میں داخل ہؤا تھا ، ذرا بھی کہیں میں نے آہٹ نہ کی تھی ۔ اب جو میں پانی

پی چکا تو سیر شکم ہو کر میں نے چاروں طرف ایک گہری نگاہ دوڑائی ۔ کہیں پر کوئی متنفس نہ تھا ، چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں ۔

پھر یکایک پلیٹ فارم کے غربی سرے پر مجھے ایک دھندلا ، متحرک سایہ سا نظر آیا اور میں اُسے دیکھ کر ہندو پانی کے بڑے مٹکے کے پیچھے چھپ گیا ۔

ہندو پانی کے مٹکے کے آگے چند گز کے فاصلے پر مسلم پانی کا سیاہ مٹکا تھا ۔ اُس سے آگے سٹیشن کے چمکتے ہوئے برآمدے میں پیتل کا گھنٹہ لگا تھا ۔ اُس کے آگے وہ تاریک سایہ کچھ ٹٹولتا ہوا ، لاشوں پر جھکا ہوا ، نظر آ رہا تھا ۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ سایہ اُوپر اُٹھا ۔ اب میں نے دیکھا ایک بڈھا ، سفید ریش ، کمزور ، منحنی سا آدمی ہے اور اُس کے ایک ہات میں سٹیشن کی سرخ اور سبز بتی والی لالٹین ہے اور وہ لاشوں میں سے گزرتا ہوا کچھ ڈھونڈ رہا ہے ۔ میں نے سوچا : "بے چارہ بڈھا ! شاید اس کا جوان بیٹا مارا گیا ہے ـــ یا کوئی اور رشتہ دار ـــ اور یہ لالٹین لیے اُسے ڈھونڈ رہا ہے اور لاشوں کو اُلٹ پلٹ کر کے اُس کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے ۔"

جب وہ میرے قریب آ گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ چہرے نہیں پہچان رہا ہے ، لاشوں کی جیبیں ٹٹول رہا ہے اور اُن میں سے نقدی ، روپے ، نوٹ ، ایسی ہی قیمتی چیزیں نکال نکال کر ایک تھیلے میں ڈالتا جا رہا ہے ۔

جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں اپنی جگہ سے دھیرے

سے اُٹھا اور پیچھے سے جا کے اُس کا ہات پکڑ لیا ۔ جب وہ ایک لاش پر جھکا ہؤا تھا ۔

میں نے ڈپٹ کر اُسے پوچھا : "تم کون ہو ؟" تو بڈھے کی گھگھی بندھ گئی ، اُس کی آنکھوں کے سفید سفید ڈیلے باہر کو نکل آئے ، اُس کے ہونٹ کانپنے لگے ، ڈرتے ڈرتے اُس کے منہ سے نکلا : "میں — میں — مسلمان ہوں !"

"مسلمان ہو تو ابھی تمھاری جان لیتا ہوں !" یہ کہہ کر میں نے اُس کی گردن دبائی ۔

بڈھے کے منہ سے کف نکل کر اُس کی داڑھی پر اُڑنے لگا ۔ تھیلا چھوڑ کر دونوں ہات جوڑ کر بولا : "نہیں ۔ نہیں ۔ میں مسلمان نہیں ہوں ۔ میں ، میں بلاقی شاہ ہوں ، کنجروڑ والا بلاقی شاہ ۔ تم نے میرا نام سنا ہوگا ۔"

ہمارے علاقے میں کنجروڑ کے بلاقی شاہ کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا ۔ وہ ہمارے علاقے کا سب سے بڑا سہاجن تھا ۔ کوئی کسان ایسا نہ تھا جو اُس کا مقروض نہ ہو ، کوئی ایسا گھر ہمارے علاقے میں نہ ہوگا جس کا زیور اُس کے گھر گروی نہ ہو ۔

"بلاقی شاہ ! تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

"میرے تو سب مارے گئے اور جو کچھ میرا تھا وہ سب لوٹ لیا گیا ۔"

"وہ تیرا تھا ہی کہاں بلاقی شاہ !"

اُس نے میری بات کا جواب نہ دے کر کہا : "صرف ایک

لڑکی بچی ہے - وہ آگے قافلے میں نکل گئی - اب جا کے اُسے ڈھونڈوں گا تو ملے گی -"

"مگر اس وقت یہاں تو کیا ڈھونڈ رہا ہے ؟"

"ہے ...... ہے ......" بڈھا مسکرایا - مجھے ، ایک ہندو کو ، دیکھ کر اُسے اطمینان ہوگیا تھا - بولا :

"بیٹا ! میری ایک ہی بیٹی ہے اب - اور میرے پاس کچھ نہیں ہے - اگر بچ بھی گیا تو جوان بیٹی کی شادی کیسے کروں گا ؟ یہی سوچ کر میں ......" وہ چپ ہوگیا اور اُس نے زمین پر اوندھے پڑے تھیلے کی طرف اشارہ کیا -

میں نے تھیلا اُٹھا کر دیکھا - اُس میں دو کے نوٹ تھے اور دس کے نوٹ تھے اور پانچ کے نوٹ تھے اور کچھ سو کے نوٹ بھی تھے اور روپے تھے اور تین چار گھڑیاں تھیں اور سونے کی چھ سات انگوٹھیاں تھیں -

بڈھا بولا : "سوچا ، یہ لوگ تو مر ہی چکے ہیں - یہ روپے ان لوگوں کے کس کام کے ؟ مسلمان آئیں گے اور ہماری دولت لے جائیں گے -"

"تمھاری دولت ؟"

"ہاں ! اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہی لیتا چلوں - ہے ...... ہے ...... یہ روپے ...... میری بیٹی کے جہیز کے کام آئیں گے ......"

"اچھا ؟ تو تو ان لاشوں میں اپنی بیٹی کا جہیز ڈھونڈتا تھا ؟" میں نے بڑی حقارت اور نفرت سے پوچھا کیونکہ مجھے

غـــدار

اُس کی بات کا بالکل یقین نہ تھا ۔

"ہاں بـابو ......" وہ گڑ گڑا کر بولا ، "اور تو یہـاں کیا ڈھونڈتا تھا ؟" اُس نے مجھ سے پوچھا ۔

میں تھوڑی دیر تک چپ رہا ، چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا ۔ "میں وہ وطن ڈھونڈتـا تھـا جسے تیرے لالچ نے کھو دیا !" میں نے بڑی اُداسی سے کہا اور بلاق شاہ کی گردن سے ہات ہٹـا لیـا کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھـا جیسے میں کسی انسان کی گردن نہیں کسی سانپ کی کینچلی پر ہات رکھے ہوئے ہوں ۔ میں نے اُسے زور سے دھکا دے کر لاشوں پر گرا دیا اور خود سٹیشن سے باہر نکل گیا ۔

سٹیشن سے بہت دور جانے کے بعد میں نے پھر پلٹ کر دیکھا تو مجھے وہی تاریک سایہ نظر آیا جو لال بتی تھامے لاشوں میں گھوم رہا تھا ـــ بلاق شاہ !

پانچواں باب

سٹیشن سے نکل کر میں ایک کچے راستے پر ہو لیا ۔ راستے کے
دونوں طرف کماد کے کھیت کھڑے تھے اور رات کی تاریکی میں
کسی قلعے کی فصیل کی طرح جید اور مضبوط نظر آتے تھے ۔
رات شرم اور خوف سے سہمی ہوئی ان کمادوں میں اُتر آئی تھی ۔
چاروں طرف اک ہولناک سناٹا تھا ۔ صرف میرے پیچھے پیچھے
آنے والی کتیا کبھی کبھی آسمان کی طرف منہ اُٹھا کے رو دیتی
تھی ۔ یہ روسی بھی عجیب کتیا ہے ۔ دن کو کبھی نہیں روتی ۔
خاموشی سے آہٹ کیے بغیر میرے ساتھ کمادوں میں دبک جاتی
ہے ۔ میں چلتا ہوں تو یہ بھی چلتی ہے ۔ میں رک جاتا ہوں تو
یہ بھی رک جاتی ہے ۔ مگر مجھ سے دور دور رہتی ہے کیونکہ
ایک دفعہ غصے میں آ کر میں نے اسے لات مار دی تھی مگر
لات کھانے سے پہلے ہی روسی پیچھے ہٹ گئی تھی اور میرا وار
خالی گیا تھا ۔ اُس وقت کے بعد روسی بڑی ہشیاری سے کام
لینے لگی تھی کیونکہ روسی کے پیٹ میں اُس کے بچے تھے اور
اُسے اُن کی حفاظت بھی کرنا تھی اور اپنی دانست میں میری
بھی ! اس لیے روسی میرے پیچھے چلتے ہوئے بھی مجھ سے دور
دور رہتی ۔ دن کو بالکل خاموش رہتی کیونکہ دن میں حملے
کا ڈر تھا ۔ جانے اتنی عقلمندی اس کتیا کو کس نے سکھا
دی تھی ؟ وہ صرف رات کو روتی تھی اور منہ اُٹھا کر آسمان

کی طرف بین کرتی تھی ۔ وہاں ، اُوپر ، آسمان پر کون ہے روسی جس کی طرف دیکھ کر تو یوں فریاد کرتی ہے ؟ آج تو آسمان کا رنگ کالا ہے اور اُس میں کہیں ایک تارہ نہیں چمکتا ۔ اور زمین بالکل خاموش اور سہمی سہمی سی ہے اور اُفق تا اُفق ایک بے زبان سناٹا چھایا ہؤا ہے ۔ ہوا بھی نہیں کراہتی ۔ اور دونوں طرف قلعے کی دیواریں بڑی مضبوط اور جید ہیں ۔ تیری فریاد کی آواز اس مضبوط تاریکی کو چیر کر کہیں نہیں جا سکتی کیونکہ تاریکی کا دل نہیں ہوتا صرف پیٹ ہوتا ہے اور فریاد صرف دل ہی سن سکتا ہے ، پیٹ تو صرف لہو پینا جانتا ہے !

کچھ عرصے تک یونہی چلتا رہا ، چلتا رہا ۔ دل میں خیال یہ تھا کہ شاید میں نے اس راستے کو ڈھونڈ کر دریا تک حفاظت سے بچ نکلنے کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے مگر چند میل چلنے کے بعد معلوم ہؤا میں راستہ بھول گیا ہوں ۔ یہ تو وہ راستہ نہیں ہے جو میں نے سمجھا ہے ۔ یہ تو کوئی اور ہی راستہ ہے اور جانے کدھر کو جاتا ہے ! تنگ راستہ آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگا ۔ آہستہ آہستہ اس راستے پر قافلے کے گزرنے کے نشان نظر آنے لگے ۔ سینکڑوں قدموں کی روندی ہوئی مٹی کہیں چھپی رہتی ہے ۔ راستے کے کنارے ایک بڈھا جاٹ کراہتا ہؤا ملا ۔ مجھے دیکھ کر اک دم خوفزدہ ہو کر چپ ہو گیا ۔ جب میں اُس کے قریب جا کے کھڑا ہو گیا تو اُس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اپنے سامنے موت کو دیکھ رہا ہو ۔

میں نے کہا : ”گھبراؤ نہیں ، میں بھی ایک رفیوجی ہوں !“

اُس کی جان میں جان آئی ۔ اُس کا اُبھرا ہؤا نرخرہ دو تین بار خاموشی سے اُوپر نیچے کو گھوما ، پھر اُس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز بڑی مشکل سے کھانسی کے ساتھ نکلی ......

" واہگورو ...... واہگورو ...... میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ ...... "

" تم نے غلط سمجھا تھا ۔ بابا ، یہاں کیوں پڑے ہو ؟ "

" میرے بچے مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے ! "

" کیوں نہیں لے گئے ؟ "

" کیونکہ مجھ سے چلا نہیں جاتا بیٹا ! بہت بڈھا ہو چکا ہوں ۔ "

" تمھارے کتنے بیٹے ہیں ؟ "

" تین تھے ۔ تینوں جوان اور تندرست تھے ۔ یہاں تک تو وہ مجھے اُٹھا کے لائے تھے مگر یہاں پر جب حملہ ہؤا تو وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے ...... "

" چچ چچ .. ... " میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے زبان چلائی ۔

بڈھے نے میری ہمدردی کا غلط مطلب لے لیا ۔ گڑ گڑا کر بولا : " بیٹا ، مجھے یہاں سے اُٹھا کر پل تک لے چلو ۔ سنا ہے راوی کا پل یہاں سے بہت قریب ہے ۔ میں پل تک پہنچ جاؤں تو تمھیں زندگی بھر دعا دوں گا ۔ بس کسی طرح مجھے پل تک پہنچا دو ۔ "

میں نے کہا : " بابا ! میں خود پل تک پہنچنا چاہتا ہوں ۔

اپنے آپ ہی کو کسی طرح پہنچا سکوں تو بڑی بات ہوگی ، تمہیں کہاں لادتا پھروں گا ۔"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو بیٹا ۔ اپنے ساتھ لے چلو ..."

میں آگے بڑھ گیا ۔

بڈھا چند قدم گھٹنوں کے بل میرے پیچھے پیچھے گھسٹتا ہؤا گڑگڑاتا ہؤا آیا ۔

"بیٹا مجھے اپنے ساتھ لے چلو ۔ بیٹا ...... بیٹا ...... وہ پل ...... بس اُس پل تک پہنچا دو ۔ بیٹا ...... بیٹا ۔"

بڈھے نے میرا پاؤں پکڑ لیا ۔

میں نے زور سے اپنا پاؤں جھٹک دیا ۔ بڈھا لڑکھڑاتا ہؤا ، پٹخنیاں کھاتا ہؤا راستے کی ایک کھڈ میں جا گرا ۔ کتیا نے زور کی ایک چیخ ماری اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی ۔ بہت دن ہوئے جیک لنڈن کی ایک کہانی میں نے پڑھی تھی ۔ اُس میں اُس نے بتایا تھا کہ امریکہ کے اصلی باشندوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ جب باپ بہت بڈھا ہو جاتا ہے تو اُس کے جھولے میں سات دن کا کھانا ، سات دن کا تمباکو اور سات دن کا پانی بھر کر رکھ دیتے ہیں اور پھر اُسے سردی کے موسم میں ایک برفیلے میدان میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں !

یہ اُس زمانے کی رسم تھی جب انسان جنگلی اور قبائلی تھے ؛ جب ذرائع پیداوار وحشی اور غیر متمدن تھے ؛ جب کھانے کو کم دستیاب ہوتا تھا ؛ تیز و تند ہواؤں سے چراگاہیں یک لخت سوکھ جاتی تھیں اور انسان قدرت کے بے رحم ہاتھوں

کے طمانچے کھاتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ نان و نفقے کی تلاش میں گھومتا تھا ۔

مگر آج تو تہذیب کا دور دورہ ہے ۔ دونوں طرف کپاد کے کھیت کھڑے ہیں ۔ دور کہیں راوی کا پل ہے اور قریب ہی میں کہیں ایک ریلوے سٹیشن پر گاڑی کوکتی ہوئی ، انسان کی عظمت کا اعلان کرتی ہوئی ، گزرتی چلی جا رہی ہے ۔

مگر وہ بڈھا کھڈ میں گرا ہوا اپنی خاموش نگاہوں سے مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے ؟

انسان کی عظمت اس تاریک کھڈ سے باہر کب نکلے گی ؟

ہونہہ ؟ میں نے اپنے سر کو جھٹک دیا ۔ اکیلے میں نے ہی انسان کی تہذیب کا کیا ٹھیکہ لے لیا ہے ؟ جب اس بڈھے کے بیٹے اسے نہ بچا سکے تو مجھ پر اس کو بچانے کی ذمے داری کہاں سے عائد ہوتی ہے ؟

جائے جہنم میں یہ بڈھا ! اور کم بخت کتیا اگر تو نے دوبارہ اس طرح مجھ پر لعنت ملامت کی تو لات مار کے تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا ۔

میں نے کتیا کو مارنے کے لیے لات اُٹھائی ، روسی فوراً پیچھے کو بھاگ گئی !

میں آگے چل دیا ۔

آگے چل کر راستہ اور کشادہ ہوگیا اور ایک بڑی اور پکی سڑک سے جا کے مل گیا ۔ کوئی قافلہ شاید ادھر سے گزرا تھا کیونکہ ایک جگہ ایک بانہہ کٹی پڑی تھی ۔ صرف ایک بانہہ ؛ باقی جسم غائب تھا ؛ نہ دھڑ ، نہ سر ، نہ ٹانگ ، نہ

پاؤں ، نہ چہرہ ، نہ کمر ؛ صرف ایک بانہہ راستے میں پڑی
تھی ؛ میرا راستہ روکے ہوئے یہ بانہہ میرے راستے میں پڑی
تھی اور اس کی ہتھیلی آسمان کی طرف کھلی تھی !

صرف ایک بانہہ ، ایک بازو ، ایک ہاتھ ...... ہاتھ کھلا
ہؤا ، آسمان کی طرف دیکھتا ہؤا - اس ہاتھ نے کبھی ہل چلایا
ہوگا ، کبھی گلی ڈنڈا کھیلا ہوگا - یہ ہاتھ کبھی کسی کی کمر
میں رہا ہوگا ، کبھی پیار سے اس نے اپنے بچے کو اُٹھایا ہوگا -
اس ہاتھ سے کبھی کسی نے پھول سونگھا ہوگا ، کبھی اس
ہاتھ نے کسی کے گیسو سنوارے ہوں گے - اس ہاتھ نے پل
بنائے تھے ، شہر اُٹھائے تھے ، پھول اُگائے تھے - اپنی محبوبہ
کے چہرے کو ٹٹول کر اس میں اپنے مستقبل کے آرام و عافیت
کی تصویریں ڈھونڈی تھیں - اور آج یہ ہاتھ مٹی میں سنا ہؤا
آسمان کو تک رہا ہے - یہ ہاتھ کیا کسی ہندو کا ہے ؟ یا مسلمان
کا ہے ؟ یا سکھ کا ہے ؟ یا عیسائی کا ہے ؟ یہ ہاتھ جو کچھ
کہتا نہیں ہے ، صرف اپنی پانچوں اُنگلیاں اُٹھائے ہوئے آسمان
کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے ، یہ کس کا ہاتھ ہے ؟ اور اگر
یہ کسی انسان کا ہاتھ ہے تو وہ انسان آج کہاں ہے ؟

ہا ہا ہا ! احمق پوچھتے ہیں ، کتے فریاد کرتے ہیں ، مگر
قافلہ آگے بڑھا جاتا ہے ......

میں ہاتھ کو پھلانگ کے آگے بڑھ گیا -

کچھ دور چلنے کے بعد ایک آواز آئی - باریک نسوانی آواز
تھی - کراہنے کی آواز تھی - میں ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا -
راستے میں ایک طرف تین بچے مردہ پڑے تھے - اُن کے

قریب ایک عورت زخموں سے نڈھال پڑی کراہ رہی تھی - مجھے
دیکھتے ہی بولی :

" ویرا ! میری جان ، پہلے مجھے مار دے ! "

عورت کی کمر کے قریب بہت سا خون بہہ کر جم چکا تھا -
کچھ تھوڑا تھوڑا سا رس رس کر بہہ رہا تھا -

میں نے اُس سے پوچھا : " تجھے کیا مسلمانوں نے مارا ہے ؟ "

وہ بولی : " نہیں ، میرے گھر والے نے تینوں بچے مار دیے
اور مجھے بھی مارنا چاہا مگر میں تنتڑی کسی طرح بچ نکلی -
مگر جان نہیں نکلتی ہے - "

" تجھے تیرے گھر والے نے کیوں مارا ؟ "

وہ کراہتے ہوئے دردناک آواز میں بولی :

" جب قافلے پر حملہ ہؤا تو میرا گھر والا مجھے چھوڑ کر
حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے جانے لگا تو میں نے اُس کی
بانہہ پکڑ لی اور اُس سے رو رو کر کہا : ' تو جا رہا ہے ! کہاں
جا رہا ہے ؟ مجھے اور میرے بچوں کو کس کے آسرے پر چھوڑ
کر جا رہا ہے ؟ '

" اس پر میرے گھر والے نے غصے سے میری طرف دیکھا
اور چھری نکال کر میرے تینوں بچوں کو ہلاک کر دیا - میں
ڈر کے مارے بھاگی ، اُس نے زور سے چھری میری طرف پھینکی
جو میری کمر میں جا لگی - قافلے والے چلے گئے - میں یہیں
پڑے پڑے تڑپتی رہی - مگر میری جان نہیں نکلتی - کسی طرح
سے میری جان نہیں نکلتی - ویرا ! تیرا بڑا بھلا ہوئے گا - تو
میری جان لے لے ، مجھے ختم کر دے ! "

میں نے کہا : "بی بی ، گھبراؤ نہیں ۔ صبح تک خود ہی تمھاری جان نکل جائے گی ۔ مجھے یہ پاپ کرنے کو کیوں کہتی ہو !"

یہ کہہ کر میں تو آگے بڑھ گیا مگر دیر تک اُس عورت کی گالیوں کی آواز میرے کان میں آتی رہی :

"وے تیرا کچھ نہ رہے ۔ تیرا گھر بار جل جائے ۔ (وہ تو جل چکا ہے ۔) تیری ماں مر جائے ۔ (وہ بھی شاید مر چکی ہوگی ۔) تیرے بال بچے بھوکے مریں (مر ہی رہے ہوں گے ۔) — ارے کم بخت تجھ سے میرا اتنا بھی نہ ہو سکا ؟"

یکایک چلتے چلتے میں نے محسوس کیا جیسے میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے تھک چکا ہوں ، ہار چکا ہوں ۔ میرے قدم ڈگمگانے لگے ۔ میں لڑکھڑا کر کمادوں کے کھردرے پتوں والے بستر پر گر کر سو گیا ۔

جب اُٹھا تو صبح ہو چکی تھی ۔ سورج نکل آیا تھا ۔ رومی میرے قدموں میں سو رہی تھی اور قریب سڑک پر سے ایک نیا قافلہ گزر رہا تھا ۔ میں کمادوں سے باہر نکلا اور ایک جست لگا کر قافلے میں شامل ہو گیا ۔ جسم و جان پر ایسی بے حسی سی طاری تھی گویا سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں شل ہو گئی ہوں ۔ اندھا دھند جس طرح سے لوگ بھاگتے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے جا رہے تھے میں بھی اُن میں شامل ہو گیا ۔ کہیں تو پہنچیں گے ، کہیں تو جائیں گے ...... یہ قافلۂ بے مہار کہیں تو پہنچے گا ؟

اب جو ہو سو ہو !

چھٹا بـاب

بھیڑ کے جس چار خانے میں "میں چل رہا تھا وہ ایک طرح سے
پورے قافلے کی نمائندگی کرتا تھا ۔ میرے آگے چار ہندو نوجوان
اپنے بڈھے باپ کو چارپائی پر لاش کی طرح لادے چل رہے تھے ۔
مختلف گٹھڑیاں اسی چارپائی پر اُس بڈھے کے اردگرد بندھی ہوئی
تھیں ۔ میرے بالکل آگے ایک سکھ جاٹ ڈھاٹا باندھے ، چھری
ہاتھ میں لیے ، اپنی بنتو کے ساتھ جا رہا تھا ۔ دونوں کے سر پر
بڑے بڑے گٹھڑے تھے ۔ میرے پیچھے ایک بڑا گڈ چلا آ رہا
تھا جسے دو بیل کھینچ رہے تھے ۔ اس گڈ پر ایک سکھ خاندان
مع اپنے سامان کے براجمان تھا اور یہ لوگ اعلیٰ حیثیت کے
زمیندار معلوم ہوتے تھے ۔ میری بغل میں ایک بڈھا بنیا ،
سیاہ رنگ اور سفید مونچھوں والا ، چل رہا تھا ۔ اُس نے اپنی
دھوتی گھٹنوں سے اُوپر کس کر باندھ رکھی تھی اور اُس کی
ٹانگوں کی وریدیں ایک مضبوط مچھلی جال کی طرح تنی ہوئی
نظر آ رہی تھیں ۔ بڈھے نے ایک ہاتھ میں پوٹلی اور دوسرے
ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام رکھا تھا ۔ بیٹی بڑی خوب صورت
تھی اور جب وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی لانبی دراز پلکیں ،
گویا بڑی کوشش سے اُٹھا کر ، کسی کی طرف دیکھتی تو دیکھنے
والے کا دل ڈوبنے لگتا تھا ۔ اُس کے شرمیلے سوگوار حسن میں
اک عجیب طرح کا بلاوا تھا اور اُس کی بھرپور جوانی سے لچکتی

ہوئی چال میں ایسی کشش تھی جیسے وہ کہیں بھاگی نہ جا رہی ہو بلکہ لوگ اُس کے پیچھے بھاگے بھاگے آ رہے ہیں ۔ وہ ہم سب لوگوں کے بیچ میں گھری ہوئی اک شمع کی مانند نظر آ رہی تھی جس سے زندگی کے اس چار خانے میں اُجالا سا ہو گیا تھا ۔ ہر شخص کنکھیوں سے اُسے دیکھ لیتا تھا اور پھر آگے چل دیتا تھا ۔ موت سر پر کھڑی تھی مگر اس حسن کے بلاوے سے انکار کی جرأت کسی میں نہ تھی ؛ ہر شخص رک کر ایک نظر سے اُسے دیکھنے پر مجبور تھا ۔

میں بنیے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ۔

کچھ دیر چلنے کے بعد میں نے بنیے سے پوچھا :

"کہاں سے آ رہے ہو ؟"

"کہیں سے بھی آ رہے ہیں ، تمھیں کیا ؟" بنیے نے بڑے تلخ لہجے میں جواب دیا ۔

دیر تک خاموشی رہی ۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے ۔ آخر کار میں نے پھر ہمت کر کے پوچھا :

"یہ تمھاری لڑکی ہے ؟"

"اور کیا تمھاری ہے ؟" بنیے نے میری طرف غرا کے کہا اور زور سے اُس لڑکی کا ہاتھ تھام لیا ۔

اُس لڑکی نے بھی میری طرف دیکھا : جیسے جھیل میں دو کنول کھل گئے ہوں ، جیسے جھیل کا پانی ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا ہو ، جیسے میں اُس جھیل میں ڈوبا جا رہا ہوں ۔ وہ شگفتہ ، شفاف ، شرابی نگاہ ــ شمپین سے چھلکتی ہوئی !

اُف ...... اُف ...... میں نے گھبرا کر منہ موڑ لیا ۔ میں دراصل ان معاملوں میں بے حد کمزور ہوں ۔ حاجی ، برک ، میاں ، سب اس بات کو جانتے ہیں اور اپنے دل بھی پہچانتے ہیں ، اور گو اس معاملے میں وہ ہمیشہ میری طرح کمزوری دکھاتے ہیں مگر وہ لوگ بڑے پیچیدہ اور پراسرار ہیں اور ہمیشہ اپنی کمزوری چھپاتے ہیں اور میں ہوں گدھا ، بے وقوف ۔ مجھ سے چھپایا نہیں جاتا ... یہیں پر مار کھاتا ہوں ۔

بنیے کو برافروختہ دیکھ کر میں نے اُس سے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا مگر میں یہ دیکھ دیکھ کر جلا جا رہا تھا کہ اُس لڑکی کی بغل میں ایک سکھ نوجوان چل رہا ہے ۔ اُس جوان کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہؤا تھا ۔ چہرے پر بڑی باریک سی ، خوب صورت سی داڑھی تھی جو اُس کے چہرے کو اور بھی پروجیہہ بناتی تھی ۔ وہ جوان اور بنیے کی یہ لڑکی ایک دوسرے سے متعارف بھی نہ تھے پھر بھی دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور گو ایک دوسرے سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے پھر بھی ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی کنکھیوں سے دیکھ لیتے تھے ۔ تھوڑی دیر تک تو میں جلتا اور کڑھتا رہا ، مگر جب میں نے دل ہی دل میں اپنا اور اُس سکھ جاٹ کا موازنہ کیا ، اپنے آپ کو ہر اعتبار سے کمتر پایا ، تو میں نے ہتھیار ڈال دیے ۔ اک آہ بھر کر آخری بار اُس لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے آگے بڑھ گیا اور قافلے کے اگلے چار خانے میں داخل ہو گیا ۔ اب میری کوشش یہ تھی کہ اپنے کسی جان پہچان کے آدمی سے ملاقات ہو جائے یا کوئی اپنے گاؤں کا

آدمی ملے جس سے اپنے خاندان والوں یا اپنے بیوی بچوں کی
کوئی خبر ملے - پھر مجھے بھوک بھی زور کی لگ رہی تھی - اگر
اُس آدمی کے پاس روٹی ہوئی تو میں ایک آدھ روٹی بھی اس سے
مانگ لوں گا - مگر تلاشِ بسیار کے بعد بھی مجھے کوئی ایسا
آدمی نہ ملا اور میں اس سلسلے میں بھی مایوس ہوگیا -

دوپہر کے وقت قافلے نے ایک کھلے بریتے میں آرام کیا -
یہاں پر کماد کے کھیت ختم ہو جاتے تھے اور دریائی گھاس شروع
ہو جاتی تھی - چند ٹیلوں پر ٹاہلیوں کے جھنڈ اپنے مٹیالے پتوں
کو لیے کھڑے تھے - دور سے راوی کا کنارہ نظر آ رہا تھا ،
موہوم سا اور اُفق میں ڈوبتا ہؤا - آسمان گدلا اور خبیث تھا -
زمین سوکھی اور چمرخ نظر آتی تھی - گرد و غبار سے لوگوں
کے چہرے اٹے ہوئے تھے - لوگ ماتھے پر ہتھیلیاں رکھ رکھ
کر ڈیرہ بابا نانک کے پل کو تلاش کر رہے تھے مگر پل کو
جانے زمین کھا گئی تھی یا آسمان - پل کہیں پر نظر نہ آتا تھا
اور وہ سب لوگ پل کی تلاش میں آئے تھے - قافلے کے لیڈروں
نے محلِ وقوع دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ لوگ ذرا راستے سے
بھٹک گئے تھے - اب اُس پل تک پہنچنے کے لیے تین میل مغرب
کی طرف جا کر، دائیں سے بائیں مڑ کر، پانچ میل اور جانا ہوگا -
جب جا کے پل ملے گا - جب تک سب لوگ کھانا کھا لیں -

لوگ دو چار ، دس بیس کے گروہوں میں بیٹھ کر کھانا
کھانے لگے - قافلے کے ہندو اور سکھ جوان ادھر اُدھر پہرہ
دینے لگے - لاٹھیوں ، چھریوں ، کرپانوں ، گنڈاسوں اور دیسی
بندوقوں سے مسلح - کچھ لوگوں کے پاس پستول بھی تھے -

کچھ لوگ یونہی ڈنڈے اُٹھائے خشونت آمیز نگاہوں سے فضا کو تک رہے تھے مگر اس اُوپری سختی اور خشونت کے باوجود سب کے دل اندر سے سہمے ہوئے تھے اور وہ جو کبھی کبھی آنکھوں میں اک چور سی ، ڈری ہوئی ، مری ہوئی سی نگاہ جھلک جاتی تھی وہ گویا دل کا سارا راز کہہ دیتی تھی -

مجھ سے رہا نہیں گیا - میں پھر اُسی بنیے اور اُس کی لڑکی کے پاس چلا گیا ، یعنی جس گروہ میں وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے - وہ لڑکی چپ چاپ اپنے باپ کے ساتھ بیٹھی کھانا کھاتی رہی - اُس کی طرف پیٹھ موڑے ہوئے وہی خوب صورت اور باوقار سکھ نوجوان کمال لاپروائی سے اپنا کھانا کھانے میں مصروف تھا - بھیڑ زیادہ تھی ، جگہ کم تھی اس لیے اُس خوب صورت لڑکی کی پیٹھ اُس نوجوان سکھ کی پیٹھ سے لگی ہوئی تھی - جانے کیسی کیسی بجلیاں اس وقت دونوں کے جسموں میں دوڑتی ہوں گی ، میں نے جل کر سوچا - مجھے بے حد بھوک لگی تھی - پھر بھی میں نے اتنا تو سوچا ، مگر اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا - بھوک نے بے تاب کر دیا - میں نے دو تین آدمیوں سے کھانا مانگا مگر کسی نے نہیں دیا - آخر سردار لہنا سنگھ اور اُس کی بنتو نے مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا - سب سے زیادہ ہیکڑی دکھانے والا اُس خوشحال زمیندار کا گھرانہ تھا جو بیل گاڑی میں سفر کر رہا تھا - اُن کے بچے اس موقعے پر بھی ایسی شان اور امارت کا ثبوت دے رہے تھے گویا وہ کسی بیل گاڑی میں نہیں بیوک میں سفر کر رہے ہوں !

ہم لوگ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ اچانک ٹیلوں کے

پیچھے سے گرد و غبار کا طوفان اُڑتا نظر آیا - پہرے داروں نے شور مچایا اور لوگ اپنا اپنا کھانا چھوڑ کر بھاگے - خوشحال خاندان کے بچے بیل گاڑی پر کھڑے کھڑے رونے لگے اور اُن کی مائیں دوہتڑ چھاتی کوٹنے لگیں -

لہنا سنگھ نے بنتو سے اپنا ہاتھ چھیڑا لیا اور اُس سے کہا:

"اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ دے!"

بنتو نے زور سے کلائی پر کلائی مار کر کانچ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں -

لہنا سنگھ نے اپنے ہونٹ بھینچ کر کہا:

"سمجھ لے آج سے تیرا خاوند مر گیا -"

بنتو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی -

لہنا سنگھ چھری ہلاتا ہؤا مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پہرے داروں کے ساتھ چلا گیا - بنتو گٹھڑی سر پر اُٹھائے اُسے دیکھتی رہی - بنیے نے گھبرا کر اپنا مال سمیٹا اور پھر چیخ مار کر بولا: "ہائے میری لڑکی ...... جمنا ... جمنا ..."

مگر جمنا کو وہ سکھ نوجوان اپنے بازوؤں میں اُٹھائے کپاد کے کھیتوں کی جانب بھاگا چلا گیا - بنیے نے چیخ کر، چلا کر بہت فریاد کی مگر اُس وقت عجب نفسانفسی کا عالم تھا - مسلمان حملہ آوروں نے قافلے پر حملہ کر دیا تھا - سب لوگ اپنی جان بچانے کی فکر میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے - کس کو

پڑی تھی کہ اپنی جان بچانے کے بجائے میں بنیے کی لڑکی کی عزت بچاتا !

میں بھی ایک طرف کو بھاگا ۔ پہلے تو بریتے سے دریا کی طرف بھاگا کیونکہ ٹاہلیوں کے جھنڈ کے پیچھے سے مسلمان حملہ آور ہو رہے تھے اس لیے میں مخالف سمت کو بھاگا مگر جب حملہ آور اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے دریا کا راستہ بھی روکنے لگے تو میں اُدھر سے پلٹ کر ہانپتا کانپتا کمادوں کی طرف ہو لیا ۔ ابھی کمادوں میں پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ کھیتوں میں سے بھی حملہ آور نکل آئے اور ایک مسلمان نے اپنا بلم میرے سینے پر رکھ دیا ۔

وہ لمحہ مجھے یاد ہے ؛ اور کبھی نہیں بھولتا ؛ اور کبھی نہیں بھولے گا ۔ بلم میرے سینے پر تھا اور میرے چاروں طرف مسلمان حملہ آور کھڑے تھے اور اُن کے پیچھے ایک بڑے گھوڑے پر ایک سوار اپنی پگڑی کے شملے سے اپنا آدھا چہرہ چھپائے رکابوں میں پاؤں ڈالے بیٹھا تھا ۔

یکایک میں نے روکنے کے انداز میں ہاتھ اُونچا کیا اور مسکرا کر اُس سوار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس کر کہا : ”کیا قسمت ہے ہماری بھی ! ساری زندگی کمیونسٹ بن کر پاکستان کے لیے پروپیگنڈا کرتے رہے ، مسلمانوں کے حقِ آزادی کے لیے لڑتے رہے اور آج جب پاکستان بن گیا ہے یہ بلم ہمارے ہی سینے پر رکھا جا رہا ہے !“

جانے کس طرح سے یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے ؛ وہ کرن

سی طاقت تھی جس نے مجھ سے یہ الفاظ کہلوائے کیونکہ نہ تو میں کبھی کمیونسٹ تھا نہ میں نے آج تک کسی سیاسی تحریک میں حصہ لیا تھا ۔ میں تو ایک کھانے پینے والا خوشباش انسان تھا جس کے ہندو ، مسلمان ، سکھ دوست بھی سبھی اسی طرح کے تھے ۔ ہم لوگ لاہور میں اپنا اپنا بزنس کرتے تھے اور شام کو چار یار اکٹھا ہو کے دادِ عشرت دیتے تھے ۔ ہمیں سیاست سے کیا علاقہ ؟ ہماری سیاست تو زبانی بحثوں ، اخباری جھگڑوں اور کتابی مطالعوں تک محدود تھی ! یہ تو بھوکے لوگوں کی باتیں ہیں ۔ پھر — کس طرح سے میرے دماغ نے اس لمحے میری جان بچانے کا یہ آخری بہانہ یا حربہ ڈھونڈ لیا تھا ۔ میں اس کے بارے میں آج بھی سوچ سوچ کر کچھ نہیں کہہ سکتا ۔

اتنا جانتا ہوں کہ میرے ان الفاظ کا اُس مخالف مجمعے کے گھڑ سوار سردار پر بجلی کا سا اثر ہؤا ۔ اُس نے تیز نگاہوں سے میرے خاموش ، مطمئن ، مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا :

"اسے چھوڑ دو ۔"

مسلمان نے بلم میرے سینے سے ہٹا لیا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ لوگ آگے بڑھے اور قافلے پر ہلہ بول دیا ۔

جوں ہی میں نے اپنے آپ کو اکیلا پایا میں سرپٹ اُلٹے پاؤں بھاگا ۔ کدھر کو بھاگا ، کیسے بھاگا ، کس طرف بھاگا ؟ یہ آج بھی نہیں جانتا ۔ اتنا جانتا ہوں کہ میں سرپٹ بھاگ رہا تھا ۔ میں کمادوں میں سے گزر رہا تھا ۔ میں کھیتوں کی مینڈھوں

پر سے دوڑتا ہؤا جا رہا تھا ۔ میں گڑھوں میں گر رہا تھا ۔ پانی دینے والی نالیوں میں سے گزر رہا تھا ۔ ٹیلوں پر چڑھ رہا تھا ۔ ریتیلے میدانوں میں سے گزر رہا تھا ۔ ریلوے لائن کی پٹری پر بھاگ رہا تھا ۔ ایک شکار کیے جانے والے جانور کی طرح اپنے جسم اور روح کا سارا زور لگا کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا ۔ کس طرف بھاگ رہا تھا ؟ کیونکر بھاگ رہا تھا ؟ کیسے بھاگ رہا تھا ؟ کتنی دیر تک بھاگتا رہا ؟ ان سب باتوں کے بارے میں آج بھی وثوق سے کچھ نہیں بتا سکتا ۔

اتنا یاد ہے کہ جب شام ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو اچانک دربار صاحب کرتار پور کے گوردوارے کے سامنے پایا ۔ گوردوارے کے مضبوط دروازے پر ایک آہنی تالا پڑا تھا اور دروازے کے ایک طرف لکڑی کے ایک بڑے اور پرانے تخت پر ایک بڈھا سکھ اور اُس کی بڈھی عورت بیٹھے ہوئے اُونچی آواز میں گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہے تھے ۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک لحظے کے لیے چپ ہو گئے ۔ میں اُنھیں دیکھ کر ٹھٹھک گیا ۔

" بابا جی ، آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں ؟ " میں نے اُس بڈھے سکھ سے پوچھا ، " کیا آپ کو کچھ معلوم نہیں ہے ! "

" ہمیں سب معلوم ہے ، بیٹا ! " اُس بڈھے سکھ نے کامل طمانیت سے کہا ، " تو بھی ہم اس لیے بیٹھے ہیں یہاں کہ جائیں تو کہاں جائیں ؟ ہماری کوئی اولاد نہیں ، کوئی بال بچہ نہیں ، دور دور تک کوئی رشتے دار نہیں ، کوئی جائیداد نہیں ، کوئی

کھر نہیں - ہم دونوں نے ساری عمر جس گورو کے چرنوں میں بیٹھ کر کاٹی ہے ، یہیں رہیں گے ، یہیں مریں گے !"

اتنا کہہ کر وہ دونوں پھر گورو نانک کی بانی کا پاٹھ کرنے لگے -

میں سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا - گوردوارے کے چاروں طرف گھوما - کہیں پر کوئی متنفس نہ نظر آیا - اور اب تو رات پھیلتی جا رہی تھی کہیں پر کوئی راستہ بھی نظر نہ آتا تھا -

گوردوارے کے قریب ایک بڑا کنواں تھا - میں اُس کی جگت پر چڑھ گیا اور رہٹ کا سہارا لے کر کنویں کے اندر چلا گیا - میں نے دونوں ہاتھوں سے رہٹ کا چکر پکڑ لیا اور اپنے جسم کو ٹنڈوں پر ڈھیلا چھوڑ دیا - ٹھنڈی ٹھنڈی ٹنڈوں کا لمس میرے تھکے ہوئے جسم کو بہت اچھا معلوم ہوُا اور میں اُسی کنویں کے اندر ، اُنھیں ٹنڈوں پر لیٹا لیٹا سو گیا - کیسے سویا ؟ کب تک سویا رہا ؟ یہ تو میں نہیں جانتا - ہاں جب اُٹھا تو صبح ہو چکی تھی - سورج کی روشنی کنویں کے اندر جھانک رہی تھی اور کنویں کی جگت پر ایک کتیا آسمان کی طرف منہ اُٹھائے رو رہی تھی -

میں کنویں سے باہر نکلا اور گوردوارے کے دروازے کی طرف بڑھا -

باہر لکڑی کے تخت پر وہ بڈھا سکھ اور اُس کی بیوی مردہ پڑے تھے - پتہ نہیں کب اور کس وقت رات کو حملہ آوروں نے اُنھیں قتل کر دیا تھا !

ساتواں باب

گوردوارے سے چند فرلانگ آگے نکل کر راستہ صاف تھا ۔ اب راوی کا کنارہ صاف نظر آنے لگا تھا اور دریا کا پل بھی ۔ اکا دکا رفیوجی بھی بھاگتے ہوئے دریا کی جانب بڑھتے ہوئے نظر آنے لگے ۔ انھی لوگوں میں میں نے جمنا کو دیکھا لیکن جمنا کے ساتھ اب کے وہ سکھ نوجوان بھی نہ تھا ، ایک گورا چٹا سرخ سرخ گالوں والا پشاوری نوجوان تھا اور اُس نے جمنا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا ۔ جمنا نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا پھر آنکھیں جھکا لیں ۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں ۔

میں نے جمنا سے پوچھا : ”تمھارے پتا کا کیا ہوا ؟“

”مارا گیا !“

”اور —— اور —— وہ ؟“

”وہ بھی مارا گیا ۔“

جمنا نے گردن اور بھی نیچے جھکا لی ۔ وہ پشاوری نوجوان کمر بند کے پستول پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا :

”چلو ، چلو ۔ آگے بڑھو ۔ فضول باتیں مت کرو !“

میں فوراً اُس سے الگ ہو کر آگے بڑھ گیا ۔ روسی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی ۔ میں نے دو تین بار اُسے دھتکار دیا مگر پھر بھی وہ مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ، پیار سے دم ہلاتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آتی رہی ۔

دریا اب قریب آ رہا تھا ۔ راوی کا پل بھی اب واضح صورت میں میرے سامنے نمودار ہو چکا تھا ۔ مگر میں نے پل پر سے گزرنا مناسب نہ سمجھا ۔ پل کے پاکستانی کنارے پر مسلمان حملہ آوروں کی آماجگاہ تھی اور پل کے ہندوستانی کنارے میں ہندوستانی حملہ آوروں کے اڈے تھے ۔ اور ہندو اور مسلمانوں کے قافلے دونوں طرف سے لوٹے اور مارے جاتے تھے ۔ صرف پل پر فوج کا پہرہ تھا جس کی کمان ایک انگریز افسر کے ہاتھ میں تھی لیکن اُس کا کام صرف اتنا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے قافلے کو باری باری پل پر سے جان و مال کی سلامتی کے ساتھ گزر جانے دے ۔ پاکستان میں کیا ہوتا ہے ، ہندوستان میں کیا ہوتا ہے ، اس کا وہ ذمے دار نہ تھا ۔ اب میں دریا کے کنارے پر کھڑا تھا ۔ کنارے کے اُس پار جان کی سلامتی تھی ۔ سامنے کے کنارے پر مجھے سینکڑوں خیمے اور چھولداریاں نظر آ رہی تھیں ۔ ہزاروں لوگ دریا کے کنارے دھوپ میں بیٹھے تھے یا لیٹے تھے ۔ عورتیں بال کھولے ایک دوسری کی جوئیں چن رہی تھیں ۔ کچھ کھانا پکانے میں مصروف تھیں ۔ کچھ لوگ نہا رہے تھے ۔ بچے ریت میں گھروندے بنا رہے تھے اور خوشی سے چلاتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دوڑ رہے تھے ۔

سامنے کنارے پر سلامتی تھی اور ایک نئی زندگی کی نوید ؟

اور میں اس کنارے موت اور زندگی کے درمیان کھڑا سوچ رہا تھا : اُس کنارے تک کیسے پہنچوں ؟ اگر پل پر سے جاتا ہوں تو راستے میں مسلمانوں کی کمین گاہوں سے گزرنا پڑتا ہے - اور جس جان کو میں اب تک کسی نہ کسی طرح بچا کر اس دریا کے کنارے لے آیا تھا اُسے اب میں مزید خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھا -

رومی میری ٹانگوں میں کھڑی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگی -

میں نے اُسے لات مار کر کہا : "چلی جا - بھاگ جا - واپس چلی جا -"

مگر کتیا وہیں کھڑی کھڑی ٹیاؤں ٹیاؤں کرتی رہی -

سوچ سوچ کر آخر میں نے اپنی ہمت بیدار کر لی - میں نے اپنے کپڑے اُتار دیے اور آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگا دی - دوسرے کنارے سے کچھ لوگ مجھے دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھ کر چلائے :

"دوڑو ... دوڑو ... وہ بے چارہ ایک ہندو نوجوان ڈوب رہا ہے - اُسے بچاؤ -"

میں دریا میں تیرنے لگا -

رومی کنارے پر کھڑی تھی - چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑی رہی - اُس کے دل کے اندر جنگ ہو رہی تھی شاید - وہ میرا ساتھ دے یا اپنے ہونے والے بچوں کا جو اُس کے پیٹ میں تھے ؟ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور وہ ٹیاؤں ٹیاؤں

کر رہی تھی ۔

مڑ جا ، روسی ! روسی ، واپس چلی جا !

مگر روسی نے دریا میں چھلانگ لگا دی ۔

پانی کا ریلا زور پر تھا ۔ پھر بھی روسی اپنی پوری طاقت استعمال کر کے میرے پیچھے پیچھے آنے کے لیے تیر رہی تھی ۔ اُس کی چھوٹی سی تھوتھنی پانی سے ذرا باہر نکلی ہوئی تھی اور اُس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ڈر اور وحشت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی مضبوطی اور ضد اور ہمت اور بہادری کی جھلک تھی ۔

میں نے چلا کر کہا : "روسی ، واپس چلی جا ۔ واپس چلی جا ۔ میرے پیچھے مت آ ۔"

روسی اپنی پوری قوت سے میرے پیچھے پیچھے تیرتی رہی ۔

پھر پانی کا ایک زور کا ریلا آیا اور روسی ڈوبنے لگی ۔ میں نے روسی کو پہلے تو اپنے سے دور جاتے دیکھا ۔ اُسے بے بسی سے منہ زور لہروں میں ہاتھ پاؤں ہلاتے دیکھا ۔ پھر اُس کی تھوتھنی ڈوب گئی ۔ پھر اُس کی آنکھیں ڈوب گئیں ۔ آخر میں اُس کے کان ڈوب گئے اور لڑھکنیاں کھاتی ہوئی اُس کی لاش پانی کے دھارے میں ڈوب گئی ۔

تجھی کو مرنا تھا روسی ؟ تجھی کو میرا ساتھ دینا تھا ؟ جب سب ساتھ چھوڑ گئے ۔ جب ملک نے ساتھ چھوڑ دیا اور زمین نے اور گلی نے اور خاندان نے اور گھر والوں نے اور دوست احباب نے ۔ جب اُس دھرتی نے بھی اپنا ساتھ چھوڑ دیا

جس کے ساتھ ہزاروں برسوں سے ہم نے محبت کا عہد و پیمان باندھا تھا ۔ تو کیا تیری ایسی حقیر کتیا نے ہی میرا ساتھ دینا تھا ؟ انسان کو یہ دکھانے کے لیے ، یہ جتانے کے لیے کہ قدرت آج بھی اپنے دل میں محبت رکھتی ہے ! اور فطرت آج بھی اُلفت اور مہر و وفا کا سبق سکھاتی ہے ۔ بے وقوف ، انجان ، احمق کتیا ! کس لیے تو نے اپنی جان ختم کر دی ، کس لیے تو نے اُس حقیر انسان کے لیے اپنے بچوں کی قربانی دے دی جو آج اپنے مقصد سے ہٹ چکا ہے اور ظلم و ستم کے لہو سے اپنے مستقبل کو داغدار کر رہا ہے ۔

روسی مر گئی اور اُس کے ساتھ شاید ایک عہد مر گیا ، ایک تہذیب مر گئی ، ایک داستان مٹ گئی ، تاریخ کا ایک ورق اُلٹ گیا ۔ اور میری آنکھوں سے آنسو اُبلنے لگے ۔ اور مجھے یہ معلوم نہ ہوا کہ میں آنسوؤں کے دھارے میں تیر رہا ہوں یا پانی کے دھارے میں ۔ کس طرح میں دوسرے کنارے پہنچا ؟ یہ بھی مجھے یاد نہیں ۔ شاید یہی آنسوؤں کا دھارا مجھے بہا کر دوسرے کنارے لے گیا ۔ شاید مرتے وقت روسی نے اپنی قوت بھی مجھے بخش دی تھی ۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جب میں دوسرے کنارے کے قریب پہنچا تو چند نوجوانوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر کنارے پر کھینچ لیا ۔

پھر ایک عورت نے کہا : ”ہئے ہئے یہ تو بالکل ننگا ہے !“ اور یہ کہہ کر اُس عورت نے اپنا دوپٹہ میرے ننگے جسم پر ڈال دیا ۔

پھر میں بے ہوش ہو گیا !

آٹھواں باب

دوسرے دن شرنارتھیوں کے کیمپ میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر میں نے اپنے خاندان والوں کو ڈھونڈ لیا ۔ واضح رہے کہ ہندو اور سکھ ، جو اُدھر سے لٹ لٹا کے آتے ہیں ، اُنھیں شرنارتھی کہا جاتا ہے اور ادھر سے جو مسلمان لٹ لٹا کر اُدھر جاتے ہیں اُنھیں مہاجر کہا جاتا ہے ۔ ہندو کبھی مہاجر نہیں ہو سکتا اور مسلمان کبھی شرنارتھی نہیں ہو سکتا ۔ شدید سے شدید مصیبت میں بھی یہ تفریق روا رکھی جاتی ہے ۔ میرے گھر والے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور سارے خوشی کے رونے لگے ۔ میری بیوی ایک الگ کونے میں ایک میلا کچیلا پیٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے بیٹھی تھی اور اُس کے تن پر اور کوئی کپڑا نہ تھا کیونکہ وہ اسی حالت میں گھر سے بھاگی تھی ۔

• میں نے اس سے پوچھا : "منا کہاں ہے !"

وہ کچھ نہ بولی ۔ چند لمحے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتی رہی ۔ آخر میں میرے پاؤں پکڑ کر رونے لگی ۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔

آخر میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ "منا کو مسلمانوں نے مار ڈالا ۔ وہ تو تمھاری بیوی کو بھی لے جاتے مگر وہ بیچاری تو کسی نہ کسی طرح بچ گئی مگر بہن کو وہ اُٹھا کے لے

جانے میں کامیاب ہوگئے۔ مدد دیر میں پہنچی۔"

"بہن سروج بھی ——؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر میں دھم سے فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ مجھ میں کھڑے رہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ خون میرے رخساروں میں چڑھا آ رہا تھا اور سارے غصے کے میرے کان بجنے لگے تھے اور میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرے لہو میں ایک طوفان سا اُبل رہا ہے۔ میں نے زور سے اپنی کنپٹیوں کو پکڑ لیا کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرا دماغ ابھی پھٹ جائے گا۔

"نہیں۔ نہیں۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا، "ایسا نہیں ہو سکتا!"

"ہزاروں کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔" میرے بھائی نے مجھے صبر دلاتے ہوئے کہا، "تمھارے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔"

اب تک میں اپنے آپ کو ایک بے حد روادار، مرنجاں مرنج، غیر متعصب سا ہندو سمجھتا تھا جس کے حلقۂ احباب میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، جس نے آج تک کسی فرقہ وارانہ تحریک میں، کسی ایسی سیاسی اور سماجی تحریک میں حصہ نہ لیا تھا جنھوں نے گزشتہ پچاس سال سے پنجاب کی فضا کو متعفن کر رکھا تھا۔ اب تک مجھے اپنی روشن خیالی اور آزاد روی پر بڑا ناز تھا لیکن اپنے بچے کے قتل اور بہن کے اغوا کا قصہ سنتے ہی جیسے میرا خون اُبل پڑا، لاوے کی طرح کھولنے لگا

اور میں وہیں بیٹھے بیٹھے مسلمانوں کو مغلظات سنانے لگا ۔ یہ نفرت کہاں سے میرے دل میں آ گئی تھی ؟ اپنے احساس کی شدت اور نوعیت پر میں خود ایک لمحے کے لیے حیران بھی ہؤا مگر پھر انتقام اور غم اور غصے کے جذبات کے ریلے میں میرے تمام اچھے خیالات خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور میں جوشِ انتقام میں دیوانہ ہوکر کھڑا ہوگیا ۔

میں نے غصے سے چلا کر کہا : "مجھے کوئی چاقو دو ۔ چاقو ۔ کوئی چھری دو ۔ چھری ۔"

میرے بھائی نے میرا ہاتھ پکڑا : "کیا کرتے ہو ؟ کیا کرتے ہو ؟"

"میں ختم کر دوں گا ۔ میں جان سے مار دوں گا ۔ میں ایک ایک مسلے کا گلا کاٹوں گا !" میں زور زور سے چیخنے لگا ۔

"کیا ہؤا ہے بھائی صاحب ؟ کیا ہؤا ہے آپ کو ؟" میرے بھائی نے مجھے پکڑ کر اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا ۔

لیکن میں نے زور لگا کر اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے آزاد کر لیا اور چلاتا ہؤا غیض و غضب میں انتقام کی دھمکیاں دیتا ہؤا وہاں سے باہر نکل گیا ...

چند گز دوڑنے کے بعد میں رک گیا اور سوچنے لگا ۔ کچھ اور لوگ بھی تو ہوں گے ، کچھ اور لوگ بھی تو میرے ہم خیال ہوں گے ۔ مجھے اُنھیں ڈھونڈنا چاہیے ...

بہت جلدی مجھے وہ لوگ مل گئے ۔ پیپل کے ایک تناور درخت کے نیچے ایک لمبا سا کیو لگا تھا ۔ میں نے قریب جا

کر ایک آدمی سے پوچھا ، جو ایک پھٹی قمیص اور میلی سی پتلون پہنے تھا :

”یہاں کیا راشن ملتا ہے ؟“

وہ نوجوان ہنسا ، بولا : ”ہاں ، یہاں sex کا راشن ملتا ہے !“

”کیا مطلب ؟“

وہ بولا : ”ایک مسلمان لڑکی ہتے چڑھی ہے - ہم لوگ اُس کی بے عزتی کر رہے ہیں -“

میں نے سامنے کے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا ۔ مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے - دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور آ کے کھڑے ہوگئے ......

”یہ کیو کب تک رہے گا ؟“ میں نے اُسی نوجوان سے پوچھا -

”جب تک وہ لڑکی مر نہیں جاتی !“ نوجوان نے جواب دیا -

تھوڑی دیر تک تو میں کیو میں کھڑا رہا - لوگ باری باری آگے بڑھتے تھے - پھر بھی کیو بہت لمبا تھا اور اُس لڑکی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں -

کھڑے کھڑے میرے دل کو کچھ ہونے لگا - جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسل رہا ہو - اُس لڑکی کی چیخیں بڑی دردناک تھیں -

”وے بھراوا ، میں تیری بہن آں - وے ویرا ، میں تیری بہن آں -“

میں نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہؤا ۔ وہ پھٹی قمیص والا نوجوان اپنی میلی پتلون سہلاتا ہؤا میری طرف زور سے قہقہہ مار کر بولا :

"بزدل !"

مگر میں وہاں سے سرپٹ بھاگ لیا ۔ بھاگتے ہوئے اپنے گالوں پر طمانچے مارتے ہوئے ، روتے روتے میں اپنے دل کو واپس جانے پر مجبور کرنے لگا ۔ میں نے منا کی بھولی صورت کو اپنی یادوں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ۔ میں نے اپنے جذبۂ انتقام کے لیے اپنی بہن سروج کی معصوم صورت کا سہارا لینا چاہا مگر ہر بار سروج کی صورت پگھل جاتی تھی اور پگھل کر اُس مسلمان لڑکی کی صورت میں بدل جاتی تھی ...... میری روح کے ویرانوں میں جیسے ازلی عورت کی پکار گونجنے لگی اور چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکارنے لگی :

"وے بھراوا ... وے ویرا ۔ اوئے ویرا میں تیری بہن آں ۔"

بھاگتا بھاگتا میں پل کو جانے والی سڑک کے قریب چلا گیا ۔

مسلمانوں کا ایک قافلہ گزر چکا تھا ۔ صرف چند لوگ باقی رہ گئے تھے ۔ سڑک سے اُتر کر چند گز کے فاصلے پر کچی زمین میں وہ ایک قبر کھود رہے تھے ۔ قریب ایک دیہاتی مسلمان کی لاش پڑی تھی ۔ صرف دھڑ پڑا تھا جس کے اُوپر اُنھوں نے ایک کپڑا ڈال رکھا تھا ۔ سر کہیں نظر نہ آتا تھا ۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا ۔

غــدار

سڑک پر سے ایک بڈھا مسلمان ایک سر کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے چلا آ رہا تھا - وہ بار بار اپنے آنسو پونچھتا، اپنے ہاتھوں میں رکھے سر کو دیکھتا تھا اور دھاڑیں مار مار کر رو رو کر کہتا تھا :

"میرا بیٹا ... میرا بیٹا ......"

آس پاس کے لوگ سب چپ کھڑے تھے -

بڈھا بے سر کی لاش کے پاس آ کے دو زانو ہو گیا - پھر وہ پاگلوں کی طرح سر کو دھڑ سے جوڑنے کی ناکام کوشش کرنے لگا - اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا :

"میرا بیٹا ! میرا بیٹا ! ! !"

سب لوگ چپ چاپ کھڑے تھے -

"میرا ایک ہی بیٹا تھا فجا ......"

بڈھے نے زمین سے آسمان تک دیکھ کر کہا :

"ایک ہی بیٹا .... میرا فجا -"

قبر کھدتی رہی - گہری ہوتی گئی -

بڈھے نے آخری بار اپنے بیٹے کی پیشانی کو چوما ...... فجے کا ماتھا صبیح تھا اور اُس کی پیشانی پر گھنگھریالے بال اُلجھ گئے تھے اور اُس کے ہونٹ پتلے پتلے اور نہایت خوب صورت تھے اور وہ اپنے خاموش سوتے ہوئے چہرے سے تکش شلا کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی بدھ کی کسی مورت سے مشابہ تھا -

قبر کھد گئی - دور سے ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو

کے نعروں کی آواز آنے لگی ۔

قبر کھودنے والوں نے جلدی جلدی سے لاش کو قبر میں سرکا دیا اور اُس کے اُوپر مٹی ڈالنے لگے ۔ پہلے تو بڈھے مسلمان نے اُنھیں روکا مگر جب دو ایک آدمیوں نے اُسے زور سے جھڑک دیا تو بڈھے نے بے بس ہوکر دعا کے لیے دونوں ہاتھ بلند کر لیے ۔

ست سری اکال ! ہر ہر مہادیو !

جلدی سے اُن لوگوں نے قبر کو مٹی سے بھر دیا اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے ۔ صرف بڈھا اُس قبر پر بیٹھا سورۃ فاتحہ پڑھتا رہا ۔

"سب تعریف واسطے اللہ کے ۔ پروردگار عالموں کا ۔ بخشش کرنے والا ۔ مالک ہے روز جزا کا ۔ تجھی کی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ۔ دکھا ہم کو راہ سیدھی ۔ راہ اُن لوگوں کی کہ نعمت کی ہے تو نے اُوپر اُن کے ۔

"سوا اُن کے جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ گمراہوں کی ۔

الحمد للہ رب العلمین ......"

ست سری اکال ! ہر ہر مہادیو !

ہوا میں برچھے چمکے اور بڈھے مسلمان کا جسم چار ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا ۔

مرنے والے کی زبان پر آخری نام خدا کا نام تھا اور مارنے والے کی زبان پر خدا کا نام تھا ۔ اور اگر مرنے اور مارنے والوں کے اُوپر ، بہت دور اُوپر ، کوئی خدا تھا تو بلا شبہ

بے حد ستم ظریف تھا !

میں وہاں سے بھی بھاگ لیا لیکن اب میری سمجھ میں بالکل یہ نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں سے بھاگ کر جاؤں تو کہاں جاؤں ؟

دوسرے دن صبح ہمارے کیمپ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا قافلہ پل پر سے گزرے گا ، دوپہر کے وقت ۔ لگ بھگ چالیس پچاس ہزار نفوس پر یہ قافلہ مشتمل ہوگا ۔ اس خبر کو سن کر ہندو اور سکھ نوجوانوں کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور وہ لوگ حملے کی تیاریوں میں منہمک ہوگئے ۔ نواحی دیہات کے جاٹوں کو بھی مدد کے لیے پکارا گیا اور تمام انتظامات جلدی جلدی مکمل کیے جانے لگے ۔

یہ تو بالکل طے تھا کہ پل کا نگران انگریز افسر پورے قافلے کو ایک ساتھ نکل جانے کا حکم نہ دے گا کیونکہ وقت پہلے سے بٹ چکا تھا ۔ دو گھنٹے کے لیے پل کو راوی پار سے آنے والے ہندو قافلوں کے لیے کھولا جاتا تھا اور دو گھنٹے ادھر سے مسلمانوں کے قافلے کو گزرنے کے لیے دیے جاتے تھے ۔ اس طرح باری باری دونوں طرف کے قافلے گزرتے تھے ۔

لیکن قافلے اتنے بڑے بڑے ہوتے تھے کہ سب لوگ ان دو گھنٹوں میں نہیں گزر سکتے تھے ۔ پھر بالعموم قافلے کے پہلے حصے میں مدافعت کا انتظام بھی عمدہ ہوتا تھا ۔ جوں جوں لوگ قافلے کی دم بنتے جاتے یہ مدافعتی نظام ڈھیلا ہوتا جاتا ۔ اسی لیے دونوں طرف سے جو لوگ ان قافلوں پر حملہ آور ہوتے

تھے وہ قافلے کے پہلے حصے کو خیریت سے گزر جانے دیتے اور جب انگریز افسر پل کے بیچ میں کھڑا ہوکر ہاتھ کے اشارے سے قافلے کو روک دیتا تو آگے جانے والے تو اپنی جان کی خیریت مناتے ہوئے جلدی سے گزر جاتے لیکن پیچھے رہ جانے والے قافلے کے لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں کیونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ اب پل دو گھنٹوں کے بعد کھلے گا ۔ بس حملہ آور انہی دو گھنٹوں کو غنیمت جان کر باقی ماندہ قافلے کے کمزور حصوں پر حملہ کر دیتے تھے اور سینکڑوں انسانوں کو لوٹ کر ، گھائل کر کے اور جان سے مار کر بھاگ جاتے تھے ۔ راوی کے دونوں کنارے ، پل کے ادھر بھی اور اُدھر بھی ، ہندوؤں ، سکھوں اور مسلمانوں کی لاشوں سے پٹے پڑے تھے ۔

دوپہر کے وقت میں بھی پل سے کوئی سو گز دور ، سڑک کے قریب کھڑا ہوکر گزرتے ہوئے قافلے کو دیکھنے لگا ۔ سڑک کے دونوں طرف ہندوؤں اور سکھوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے تھے ۔ کچھ لوگ خاموش کھڑے تھے ، کچھ لوگ استہزائیہ انداز میں فقرے کس رہے تھے ۔ جو جتنا بڈھا تھا اُتنی ہی مغلظات قافلے کے مسلمانوں کو سناتا تھا اور وہ لوگ سر جھکائے چلے جا رہے تھے — گٹھڑیاں اُٹھائے ہوئے ، بچوں کو بغل میں دابے ہوئے ، اوپر چارپائیاں اور چارپائیوں پر سامان رکھے ہوئے ، کمزوروں کو سہارا دیتے ہوئے ، بچوں کو ڈانٹتے ہوئے ، اپنی بہو بیٹیوں کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے — چل رہے تھے ۔ ایک کمزور ، منحنی سے ہندو لڑکے نے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک مسلمان لڑکے پر تھوک دیا ۔

مسلمان لڑکے کا چہرہ تمتما اُٹھا - اُس نے بجلی کی سی تیزی سے گھونسا تانا اور سڑک سے باہر نکلنے ہی کو تھا کہ اُس کے باپ نے اُسے پکڑ لیا اور جھڑک کر اُسے سڑک سے ہٹا کر دوسری طرف کر لیا ۔اور پھر وہ چلتے چلتے اُس ہندو لڑکے اور اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے جوان ہندوؤں سے معذرت کے انداز میں بولا :

"معاف کرنا ، بچہ ہے نا !"

ہندو لڑکا ، جو پہلے تو ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا تھا ، اب شیر ہوکر آگے بڑھ آیا اور اپنی باریک ، منحنی آواز میں مسلمانوں کو گالیاں دینے لگا - اُس کے اردگرد کے لوگ اُس کی بہادری پر بے حد خوش ہو رہے تھے !

ایک ادھیڑ عمر کا ہندو بولا : "دیکھو ، ان سالوں کی اس وقت جان نکل رہی ہے ، چوں نہیں کرتے اور اس سے پہلے ہمارے ہندوستان میں داماد کی طرح گھومتے تھے اور مسجد کے آگے ذرا سا بینڈ بجانے سے سیخ پا ہو جاتے تھے اور اب ہم گالی بھی دیتے ہیں تو کیسے خاموشی سے سن کر چلے جا رہے ہیں ... ان کی ... (گالی) -"

یکایک سڑک پر چلتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے مسلمان پر اُس کی نظر پڑ گئی اور گالی آدھی ہی اُس کے منہ میں رہ گئی - وہ حیرت سے اُس مسلمان کی طرف دیکھ کر حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے متاثر ہوکر چیخ اُٹھا :

"اوئے احمد یار !"

احمد یار نے اپنے سر کی گٹھڑی کو ذرا سا اُوپر اُٹھا کر

سڑک کے باہر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی - پھر پہچان کر خوشی سے چلایا : "اوئے نتھو ، سور دیا پترا ، توں کتھے ؟"

احمد یار اور نتھو دونوں گلے مل رہے تھے اور رو رہے تھے - معلوم ہؤا دونوں ایک قصبے کے موچی تھے - بچپن ، لڑکپن اور جوانی کا کچھ حصہ اکٹھے گزرا - پھر تلاشِ معاش میں ایک موچی لاہور چلا گیا دوسرا جالندھر - اب برسوں کے بعد دونوں گلے مل رہے تھے اور رو رہے تھے -

نتھو بولا : "تو میرے گھر چل کے رہ - اوہدی بھن دی جیہڑا تیری طرف اکھ اُٹھا کے تکے !"

"نہیں نتھو ، میں جاؤں گا ، ضرور جاؤں گا - اب نہیں رہ سکدا - تیرے بھراواں نے ساہنوں کوہ سٹیا -"

احمد یار نے اپنا تہمد اُٹھا کے اپنی پنڈلی کا زخم دکھایا جس پر ایک گندی سی پٹی بندھی ہوئی تھی -

"وہ تو میری قسمت تھی میں بچ گیا -" احمد یار بولا ، "مگر ظالموں نے مارنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی -"

"میرا بھی یہی حال اُدھر ہؤا - جوان پتر راستے میں مارا گیا -"

"ہائے ہائے ...... یہ زمانے کو کیا ہؤا ہے نتھو ؟ ارے ہم تو جالندھر میں بھی جوتے بناتے تھے اور لاہور جا کر بھی جوتے بنائیں گے پھر یہ جھگڑا کس بات پر ہؤا ہے ؟"

نتھو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُس نے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنی کنپٹی کے بالوں کو کھجا کر کہا : "جانے کی ہوا

ہی خراب ہے ، احمد یار !"

" اچھا - میں چلاں ..." احمد یار جلدی سے بولا ، "نہیں تو قافلہ نکل جاوے گا -"

دونوں دوست آخری بار ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے - جب احمد یار آگے چلا گیا تو پیچھے سے نتھو نے زور سے چلا کے کہا :

" چک بختیار خاں کے چاچا عبدالغنی کو میرا سلام کیہیں !"

دور سے " ہچھا ! ہچھا ! !" کہہ کر احمد یار قافلے میں گم ہو گیا -

جب نتھو اپنے دوست سے باتیں کر کے مڑا تو آس پاس کے سارے ہندو گھور کر اُسے دیکھ رہے تھے جیسے اُس پر نفرین بھیج رہے ہوں - نتھو کے چہرے پر ایک کھسیانی سی ہنسی آئی - اُس نے اپنے بچاؤ میں کچھ کہنا چاہا مگر زیر ِلب کچھ بڑبڑا کر رہ گیا اور جلدی سے سر جھکا کر وہاں سے کھسک گیا -

اُس وقت جانے میرے دل میں کیا آئی ، میں اچانک قدم بڑھا کر قافلے کے اندر ہو لیا اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا - صرف ایک آدمی نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا :

" تم یہاں کیسے ؟"

میں نے فوراً کہا : " یہاں تک ہندو بن کر آیا تھا ، اب اپنے وطن جا رہا ہوں ـــ پاکستان !"

" الحمد للہ -" اُس مسلمان نے مسکرا کر کہا - اُس کا شبہ دور ہو گیا تھا اور اگر نہ بھی ہوتا تو مجھے کوئی پروا نہ تھی -

میں بڑی دلیری سے دو سو گز فاصلے تک یعنی پل تک تو جا سکتا تھا - پل تک تو مجھے کسی قسم کا ڈر نہ تھا - قافلے کے دو رویہ ہندو اور سکھ کھڑے تھے ، پل تک - پلَ پر انگریزوں کی فوج تھی - مگر پل تک تو ہر ہندو شیر تھا اور ایک لاکھ مسلمانوں پر بھاری تھا اس لیے میں بے خطر ہوکر قافلے میں اُن لوگوں کے ساتھ چلنے لگا -

میں نے اپنے قریب بائیں طرف کے ایک سفید ریش بڈھے سے پوچھا : ”بابا تم کہاں سے آئے ہو ؟“

”مورینڈے سے آیا ہوں بیٹا -“

”تمھارا خاندان کہاں ہے ، بابا ؟“

بڈھے نے کہا : ”قبر میں !“

میں چپ ہوگیا - بڈھے کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا - آخر بڑی مشکل سے وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا :

”مورینڈے کے سکھوں نے میری تینوں بیٹیاں رکھ لیں اور میرے تینوں بیٹوں کو قتل کر دیا - اگر وہ مجھے اور میری بڈھی بیوی کو بھی مار ڈالتے تو ہم دونوں پر بڑا احسان کرتے !“

بڈھے کی دبلی پتلی کھوسٹ بیوی اپنے سفید بال بکھرائے اُس کے ساتھ چل رہی تھی - اُس نے عجیب مسکراہٹ سے اپنے میاں کی طرف دیکھا اور ہونٹ پر اُنگلی رکھ کر بولی : ”ہش ، شور مت کرو - میرا بیٹا جاگ جائے گا !“

"بیٹا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" وہ میری طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولی، "میں حاملہ ہوں نا۔ حاملہ۔ میرے پیٹ میں میرا بیٹا ہے!"

یکایک وہ مجھ سے پیچھے ہٹ کر سیدھی تن کر کھڑی ہو گئی اور زور زور سے اپنا پیٹ بجانے لگی۔

"میں گابھن ہوں۔ میں گابھن ہوں۔ میں گابھن ......"

اُس کی ہنسی کی چیخیں مجھ سے برداشت نہ ہو سکیں۔ میں وہیں کوڑے کا کھڑا رہ گیا۔ بڈھا مسلمان اپنی پاگل بیوی کو گھسیٹتا ہوا آگے لے گیا۔

اب میں پھر قافلے کے ساتھ چل رہا تھا۔ جانے میرے دل میں کیا بات تھی؟ میں کیا چاہتا تھا؟ میں کیوں ان لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا؟ مجھے خود معلوم نہ تھا مگر مجھ سے اس قافلے سے الگ بھی نہ رہا جاتا تھا۔ اب کے میرے ساتھ خوشحال اور مہذب مسلمانوں کا ایک خاندان چل رہا تھا۔ صورت شکل سے، اطوار سے، گفتگو سے، چال ڈھال سے یہ لوگ پڑھے لکھے اور متمدن معلوم ہوتے تھے۔ ان لوگوں کے لباس گو میلے تھے لیکن اعلیٰ قسم کے کپڑے کے معلوم ہوتے تھے۔ فراک پہنے ہوئے آٹھ دس برس کی دو بچیاں تھیں۔ ایک چودہ برس کا لڑکا تھا جس کے چہرے پر خط کا آغاز ہو چکا تھا۔ لڑکے نے نیلی دھاری کی شرٹ اور بلو بلیک رنگ کی نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی دونوں بہنوں کو سنبھالے ہوئے چل

رہا تھا ۔ اُس کے باپ نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جو برقع اوڑھے ہوئے تھی ۔

اُس مسلمان نے میری طرف دیکھ کر خوشی سے مسکرا کر کہا : "خدا کا شکر ہے اب ہم پاکستان تک آ پہنچے ہیں !"

"راستے میں خیریت رہی ؟" میں نے پوچھا ۔

"اُس پاک پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہمارا کوئی جانی نقصان نہیں ہوُا ۔ اگلے دو گھنٹوں کے بعد ہم پاکستان میں ہوں گے ۔ وہ سامنے رہا ہمارا نیا وطن !"

• ایک عجیب غرور اور مسرت سے سب کے چہرے مجھے سرشار اور مسرور نظر آئے ۔ جیسے اُن کے چہروں پر قوس قزح کے سارے رنگ بکھر گئے ہوں ! اُن سب کے قدم بے ساختہ پل کی جانب بڑھتے ہوئے تیز تر ہوتے گئے ۔

میں نے اپنی چال دھیمی کر دی ۔ وہ لوگ آگے بڑھ گئے ۔

اب میرے ساتھ ایک لڑکی چل رہی تھی ۔ اور یکایک مجھے ایسا محسوس ہوُا جیسے اس پورے قافلے میں وہ بھی میری طرح اکیلی ہے ۔ میں نے اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا : "تم ہندو ہو نا ؟"

میری بات سن کر وہ ٹھٹھکی ۔ ٹھٹھک کر آہستہ آہستہ چلنے لگی ۔ اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا لیکن میں اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے جذبات سے پہچان گیا تھا کہ میرا تیر نشانے پر بیٹھا ہے ۔

بوٹا سا قد ، سنہرے بال ، سنہرے گال ، سنہری ٹھوڑی ،

غـــدار

گلاب کی سی رنگت والے پتلے لب ، لچکتی ہوئی کمر ، اُبھرا ہوا سینہ ، چال میں تفاخر اور حسن ، مضبوطی اور بے نیازی ، کانوں کے طلائی بندے ہلتے ہوئے ، آنکھوں کی پتلیاں اک دردناک خواب میں گرفتار ۔

"تم کون ہو ؟"

"میں پاروتی ہوں ۔"

"کہاں سے آئی ہو ؟"

"چیمہ کلاں سے ۔"

"کہاں جا رہی ہو ؟"

"پاکستان !"

"پاروتی تم پاکسنان کیوں جا رہی ہو ؟"

"وہ میرے محبوب کا وطن ہے ؟"

"تمھارا محبوب ؟"

"وہ میرے گاؤں کا رہنے والا تھا ۔ امتیاز اُس کا نام تھا ۔ اُس کا باپ ہمارے قصبے کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا اور کٹر مسلم لیگی تھا ۔ میرا باپ گاؤں کا سب سے بڑا سیٹھ تھا اورکٹر آریہ سماجی تھا مگر امتیاز مجھ سے پیار کرتا تھا اور میں اُسے چاہتی تھی اور ہم دونوں اکٹھے کالج میں پڑھتے تھے ایم ۔ اے میں ......

"پاکستان بن جانے پر امتیاز کے ماں باپ اپنے سارے خاندان کو لے کر ہوائی جہاز سے لاہور چلے گئے مگر امتیاز

نہیں گیا ۔ اس کے ماں باپ نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانا ۔ اُس نے اپنی پارو کے لیے اپنا پیارا وطن چھوڑ دیا کیونکہ میں نے اُس سے شادی کا وعدہ کیا تھا ۔"

"پھر ؟"

سر جھکائے خاموشی سے وہ دیر تک میرے ساتھ چلتی رہی ۔ آخر میں آہستہ سے بولی : "شادی سے پہلے میرے باپ نے اُسے مروا ڈالا ! میرے امتیاز کو ہندو غنڈوں سے مروا ڈالا ! امتیاز ۔ جس نے ہم پر بھروسہ کیا تھا ... میرا امتیاز بڑا خوب صورت جوان اور تگڑا تھا مگر وہ اکیلا تھا اور وہ لوگ بہت سے تھے اور جب میں وہاں پہنچی تو اُس کی لاش کو چیلیں کھا رہی تھیں ۔"

آنکھ میں ایک آنسو نہیں ، لب پر ایک لرزش نہیں ، گردن میں ایک خم نہیں ...... وہ سیدھی سرو قد چل رہی تھی ، یہ عجیب سی لڑکی ۔

"ہوں !" میں نے سوچ سوچ کر کہا ، "امتیاز تو مر چکا ، اب تم پاکستان جا کر کیا کرو گی ؟"

"میں اُس کی ماں کے پاس اُس کی بیوہ بن کر رہوں گی !" پاروتی نے بڑے فخر سے تن کر کہا ۔

میں حیرت سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا ۔ یکایک پل قریب آ گیا ۔

پاروتی نے پل پر ایک پاؤں رکھا ۔

"پاروتی ! تم کہاں جا رہی ہو ؟ لوٹ آؤ ، معصوم ،

بے وقوف لڑکی ! بھلا کس نے محض اک تصور کی خاطر اپنا دیس بیچ دیا ہے ؟ عورت اپنے شوہر کے لیے مرتی ہے - ماں اپنے بیٹے کے لیے جان دیتی ہے - بہن اپنے بھائی پر واری جاتی ہے - یہ سب سمجھ میں آنے والے رشتے ہیں ، خون اور جسم کے رشتے ہیں لیکن تم نے تو کسی سے کوئی ایسا رشتہ نہیں باندھا - تم نے تو امتیاز سے شادی نہیں کی - تم تو اُس کی بیوہ بھی نہیں ہو - تمھاری کوکھ میں اُس کا بچہ بھی تو نہیں ہے - تم اُس کے خاندان ، ملک اور مذہب کی بھی نہیں ہو پھر ہم سب کو چھوڑ کر تم کدھر جا رہی ہو ؟ اپنے تصور کی ڈور سے بندھے بندھے کس منزل کو روانہ ہو رہی ہو ؟ پگلی ! بھلا اس دنیا میں کوئی پیار کے لیے بھی یوں مرتا ہے ؟ آدمی مرتے ہیں پیسے کے لیے ؛ عورت کے جسم کے لیے ؛ دولت کے لیے ؛ طاقت کے لیے ؛ ملک کے لیے ؛ مذہب کے لیے ؛ آخرت کے لیے ؛ لیکن محض ایک تصور کو لے کر مر جانا اور ساری زندگی کسی کی یاد میں ایک اجنبی ماحول میں بتا دینا ! ! ذرا سوچو تو پاورتی ، کتنی بڑی احمقانہ بات ہے ! واپس آ جاؤ - چاند ایسے مکھڑے والے پاروتی ، اپنے اس سوگوار لیکن پھول کی طرح مہکتے ہوئے شاداب حسن کو دیکھو - دیکھنے والوں کی ہندو نظروں پر رحم کرو اور واپس آ جاؤ - پھر ہم آہستہ آہستہ تمھارے دل سے امتیاز کی یاد کو محو کر دیں گے - ہم - جو تمھارے دھرم والے ہیں ، تمھارے ملک اور مذہب والے ہیں - تمھاری سوسائٹی اور سماج والے ہیں - ہم - جو نیکی اور بدی کی آخری پرکھ والے ہیں - ہم آہستہ آہستہ تمھیں اپنے مانوس

ماحول کے گھیرے میں لے آئیں گے - آہستہ آہستہ میٹھے سبھاؤ سے ، نرم دباؤ سے ، دم سے دلاسے سے تمھیں ہم راستے پر لے آئیں گے - ہم تمھیں اس کے لیے تیار کر لیں گے کہ تم دھیرے دھیرے ادھر اُدھر دیکھنے لگو ، دیکھ کر مسکرانے لگو ، مسکرا کر ہنسنے لگو -

آہستہ آہستہ ، بہت ہی آہستہ آہستہ ہم تم کو پچکار کر اُس آگ کے قریب لے آئیں گے جس کے گرد سات چکر کھا کر تم بالکل کسی دوسرے اجنبی کی ہو جاؤ گی اور اُس کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر خوش و خرم اپنے سسرال کو چلی جاؤ گی - ہم نے ایسا ہی کیا ہے - ہزاروں سال سے ایسا ہی کیا ہے ...... ہم سے بہتر محبت کو دفن کرنے والے تمھیں کہیں نہیں ملیں گے !

" واپس آ جاؤ - پاروتی ... واپس آ جاؤ - "

لیکن پاروتی نے مڑ کر ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا - وہ سیدھی پل پر سے گزرتی چلی گئی - سرو قد اور پر غرور - اور جب وہ آدھے پل کو پار کر گئی تو یکایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر اور پل کے درمیان کھڑے ہو کر راستے کو روک دیا !

نواں باب

جو پل کے اُس پار چلے گئے تھے وہ خوش تھے ۔ جو ادھر رہ گئے تھے وہ خوف سے لرزاں تھے اور بار بار ادھر اُدھر اپنے آگے پیچھے دیکھتے تھے ۔ اُس خوش حال مسلمان گھرانے کا لڑکا اپنی دونوں بہنوں کو لے کر پار چلا گیا تھا لیکن عین موقعے پر انگریز نے بیچ آ کے راستہ کاٹ دیا تھا اور اُن بچوں کا مسلمان باپ اور اُن کی ماں ادھر رہ گئے تھے ۔ مسلمان باپ نے بہت فریاد کی : "ارے دیکھو ، میرے بچے اُدھر ہیں ۔ بس مجھے اور میری بیوی کو گزر جانے دو ۔ پلیز کمانڈر صاحب !"

مگر انگریز افسر نہیں مانا ۔ ناچار دونوں میاں بیوی پل کے ایک طرف لگ کر کھڑے ہوگئے اور اپنے بچوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے ۔ مگر انگریز افسر نے اُنھیں پل پر بھی نہیں رہنے دیا ۔ اب اُدھر سے ہندوؤں کا قافلہ آنے والا تھا اس لیے اُس نے ان مہاجروں سے پل کو خالی کرا کے ان لوگوں کو پیچھے دھکیل دیا ۔ دونوں میاں بیوی دوسرے مہاجروں کے ساتھ پل کے باہر سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو گئے ۔ وہ شریف مسلمان بار بار پاؤں پٹکتا تھا اور کہتا تھا :

"کیسی حماقت ہے ؟ کیسی حماقت ... ایک خاندان کو یوں ہاتھ کی جنبش سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا ۔ اگر وہ

فوجی افسر ہم دونوں کو جانے دیتا تو اُس کا کیا بگڑتا تھا۔"

اُس کی بیوی اُسے سمجھانے لگی : "صبر کرو ۔ ابھی دو گھنٹے کے بعد پھر یہ پل ہمارے لیے کھلے گا !"

تسلی تو اُس نے بھی اپنے خاوند کو دی مگر دونوں کے دل اپنے بچوں کے لیے خوف زدہ تھے اور وہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کے پل کے اُس پار دیکھتے تھے جہاں اُن کے بچے کھڑے تھے ۔

اب اُدھر سے ہندوؤں کا قافلہ آ رہا تھا ۔ پل پر سے گزرتا ہوا قافلہ سڑک پر آ گیا ۔ سڑک کے کنارے مہاجر کھڑے تھے اور لٹے ہوئے شرنارتھوں کو تک رہے تھے ۔ شرنارتھی گزرتے جا رہے تھے اور تباہ حال مہاجروں کو دیکھ رہے تھے اور دونوں کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا اور ایک ہی جواب تھا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں کی وہ خشمگیں نفرت کسی گہرے جرم کے احساس سے بوجھل ہو جاتی اور دونوں ایک دوسرے سے نظر چرا چرا کے ادھر اُدھر دیکھنے لگتے ، جیسے کوئی بھی اُس تلخ حقیقت کا سامنا نہ کرنا چاہتا ہو ۔

میں مہاجروں کے ٹولے سے نکل کر شرنارتھیوں کے قافلے میں آ گیا اور اب اُن کے ساتھ مخالف سمت کو چلنے لگا ۔ لیکن مجھے بالکل احساس نہ ہوا کہ میں نے اپنی سمت تبدیل کی ہے ۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں ابھی تک اُسی قافلے میں چل رہا ہوں !

تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس قافلے میں اپنے خاندان کے کئی افراد مل گئے ۔ دو تایا زاد بھائی ، ایک چچا ، ایک پھوپھا اور چند بوڑھی عورتیں ۔ اور یہ سب لوگ میرے باپ کی لاش کو چارپائی پر لاد کر لا رہے تھے جو ابھی پل کے اس طرف بریتے میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا !

دسواں باب

باپ کی لاش ایک کونے میں کپڑے سے ڈھکی پڑی تھی ۔ لوگ رو پیٹ کے چپ ہو گئے تھے ۔ عورتیں شام کا کھانا پکانے میں مصروف تھیں ۔ ایسے موقعوں پر اکثر گاؤں کے دوسرے گھروں سے کھانا آ جاتا تھا مگر یہ تو کیمپ تھا ۔ یہاں سب کو اپنی پڑی تھی ۔ کون کس کی مدد کرتا ؟ سبھی بھوکے ننگے تھے ۔ بھائی صاحب چتا وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے گئے تھے ۔ میں ایک جھلنگی چارپائی کے پائے کا سہارا لے کر بیٹھا تھا کہ اتنے میں چند ہندو اور سکھ رضاکار آ گئے ۔ اُن کا سرغنہ لاہور کا مشہور ہندو پہلوان بلو تھا ۔

بلو کی ایک آنکھ کانی تھی ۔ دوسری بلی کی آنکھ کی طرح تھی ۔ سب لوگ اُسے بلو کہتے تھے ۔ بلو نے لاہوری گیٹ کے اندر مدی شاہ کے اکھاڑے میں ہندو پہلوانوں کا ایک گروہ تیار کر رکھا تھا اور ہندو رئیس لوگوں کے کہنے پر یہ لوگ فرقہ وارانہ فساد میں ہندوؤں کی طرف سے لڑا کرتے تھے ۔ بلو دو تین بار لاہور میں مجھ سے بھی چندہ مانگنے آیا تھا مگر میں نے کبھی نہیں دیا اس لیے بلو نے اس وقت جو مجھے دیکھا تو اُس کے پُر غرور لہجے میں ایک عجیب سی تضحیک کی جھلک نمودار ہو گئی ۔

بلو بولا : ”ابھی تھوڑی دیر میں ہم لوگ مہاجروں پر

حملہ کرنے والے ہیں - شام ہو چکی ہے - دو تہائی قافلہ گزر چکا ہے - بس اب اس کی دم باقی رہ گئی ہے - وقت حملے کے لیے بالکل ٹھیک ہے !"

میں نے کہا : "حملہ کر دو - مجھے کیا ؟"

"ہاں ! ہاں ! ! تمھیں کیا ؟" بلو نے ذرا کڑے لہجے میں کہا ، "ایسے بزدل ہندوؤں نے تو پاکستان بنایا ہے - ان کا باپ بھی مر جائے تو یہی کہیں گے ہمیں کیا ؟"

میں چارپائی سے لگ کر اُکڑوں بیٹھا تھا - یکایک غصے سے سیدھا تن کر بلو کے سامنے کھڑا ہو گیا - بلو نے کامل اطمینان سے میری طرف دیکھ کر کہا : "حملہ کرنے کے لیے ہم لوگ ہر گھر سے ایک حملہ آور لے رہے ہیں - آدھے گھنٹے میں راشن ڈپو کے پاس آ جانا - بلموں ، نیزوں ، بندوقوں ، گھوڑیوں کا سب انتظام ہو چکا ہے !"

چاروں طرف تیز تنی ہوئی برمے کی طرح چھیدتی ہوئی نظریں مجھ پر گڑی تھیں - میں نے دانت پیس کر کہا : "میں آ جاؤں گا !" بلو ہنسا اور آگے بڑھ گیا -

اُس کی ہنسی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی - میں اُسی وقت اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا - ہر گھر سے ، ہر خاندان سے ہم لوگ ایک دو آدمی لیتے گئے - جوں جوں حملہ آوروں کی تعداد بڑھتی گئی لہجے کی سختی ، نگاہوں کی خشونت بڑھتی گئی - ہاتھوں کی اُنگلیاں بے تاب ہونے لگیں - کسمساتے ہوئے لوگوں کے چہرے بھڑکتے گئے اور جب ہم لوگ راشن ڈپو پر

پہنچے تو وہاں پہلے سے پانچ سو آدمیوں کا چیختا چلاتا مجمع تھا اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا ۔

میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں خواب میں چل رہا ہوں : میرے اردگرد جتنے بھی انسان تھے کسی بھیانک خواب کی پرچھائیاں معلوم ہوتے تھے ۔ راشن ڈپو کے قریب ہندو نوجوان نیزے بلم تقسیم کر رہے تھے ۔ بندوقیں صرف سرغنہ لوگوں کو دی گئی تھیں ۔ کسی نے میرے ہاتھ ایک نیزہ تھما دیا ، میں نے تھام لیا ۔ کسی نے کہا : "وہ تمھارا گھوڑا ہے ۔" میں گھوڑے پر نیزہ لے کر سوار ہوگیا ۔

ہم لوگوں نے ڈکی موڑ پر جا کر ، جہاں برگد کا ایک بہت بڑا پیڑ ہے، مسلمانوں کے قافلے پر حملہ کر دیا ۔ سَت سری اکال اور ہرہر مہادیو کے نعروں کے ساتھ فضا میں مہاجروں کی چیخیں بلند ہوئیں ۔ مہاجروں کے قافلے کے افراد سڑک چھوڑ چھوڑ کر ریتیلے میدان میں بھاگنے لگے ۔ کچھ نوجوان مسلمان بڑی بہادری اور جی داری سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے مدافعت کرنے لگے مگر حملہ آوروں نے ڈکی کے موڑ پر سے راستہ کاٹ کر مہاجروں کو سڑک سے بھگا کر ڈکی کے مشہور ریتیلے میدان کے گھیرے میں لے لیا جہاں اس سے پہلے بھی سینکڑوں مسلمانوں کی گردنیں کٹ چکی تھیں ۔

میرے چاروں طرف مشعلیں سی جل رہی تھیں اور چاروں طرف گھمسان کا رن پڑا تھا اور میں نیزہ اُٹھائے ، گھوڑا دوڑاتے ہوئے ادھر سے اُدھر شکار کی تلاش میں پھرتا تھا ۔ میرے سامنے

ایک بڈھا مسلمان ایک چھوٹے سے بچے کو گلے سے چمٹائے بھاگا جا رہا تھا ۔ اُس کی میلی کچیلی بنیائن جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اُس نے سلیٹی رنگ کا ایک میلا سا تہمد باندھ رکھا تھا ۔ وہ بھاگتا جا رہا تھا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا ۔ بچہ خوف سے چیخ رہا تھا ۔ اُس کے دونوں ننھے ننھے ہاتھ اُس بڈھے کی گردن سے چمٹے ہوئے تھے ۔ بھاگتے بھاگتے اُس مسلمان کو ٹھوکر لگی اور اُس کی پوٹلی زمین پر گر گئی اور جب وہ اُسے اُٹھانے کے لیے مڑا تو میں نے تیزی سے گھوڑا دوڑا کر نیزہ اُس کے سینے پر رکھ دیا ۔

بڈھے نے پوٹلی وہیں زمین پر چھوڑ دی ، اُس کا ہاتھ ذرا سا اپنے سینے سے اوپر اُٹھا اور اُس نے میری طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ کر اپنے ہاتھ کو انکار کے انداز میں ذرا ہلاتے ہوئے کہا :

”ناں ! ناں ! بیٹا ۔ ناں ۔ مجھے نہ مار !“

بس اُس ایک لمحے کی تصویر ہی ہمیشہ کے لیے میرے ذہن میں گھومتی ہے ۔ اُس بڈھے کا منہ خوف سے کھلا تھا اور اُوپر اُٹھا ہوا ہاتھ ڈر اور التجا سے لرز رہا تھا اور پھٹی بنیان سے اُس کا سینہ نظر آ رہا تھا ۔ جہاں پر میرا نیزہ اُس کے سینے سے لگا تھا وہاں پر سفید سفید بال تھے ، بڑے بھلے سے سفید بال ، جیسے میرے باپ کے سینے پر تھے ۔ اور اُس بڈھے کی بھنویں بھی سفید تھیں ، جیسے میرے باپ کی تھیں ۔ اور جس نرمی اور شفقت اور التجا سے اُس نے مجھ سے کہا : ”ناں ! ناں ! بیٹا ۔ ناں مجھے نہ مار !“ اُس لہجے سے بھی مجھے اپنا

باپ یاد آ گیا اور یکایک میری آنکھوں میں آنسو سے چبھنے لگے اور میں نیزہ اُس کے سینے سے ہٹانے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی :

"او کتے باہمن تو کیا لڑے گا - پرے ہٹ جا ! غدار !"
اور یہ کہتے ہوئے بلو اپنی سیاہ گھوڑی پر سوار سرپٹ آگے آیا اور بلم سے اُس بڈھے مسلمان کا سینہ چیرتے ہوئے آگے چلا گیا -

یکایک میں نے اُس بڈھے مسلمان کو سیاہ گھوڑی کے قدموں میں لڑکھڑا کر گرتے دیکھا اور اُس ننھے بچے کو پٹخنیاں کھا کر ایک چھوٹی سی کھڈ میں لڑھکتے دیکھا - پھر سینکڑوں حملہ آوروں کے قدم اُس زمین کو روندتے چلے گئے اور یکایک میری آنکھوں میں اتنے آنسو بھر آئے تھے کہ میں آگے کچھ نہ دیکھ سکا - گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے میرا سارا جسم کانپنے لگا اور میرے ذہن اور جسم اور روح میں ایک متلی آمیز کراہت کا احساس بڑھتا گیا -

یکایک میں نے ہاتھ جھلا کر نیزہ زور سے دور پرے پھینک دیا اور گھوڑا دوڑا کر اُس مقتل سے سر جھکائے باہر نکل آیا -

سنا ہے چار پانچ گھنٹے کے بعد ملٹری کی کمک وہاں پہنچی مگر جب تک حملہ آور اپنا کام کر کے بھاگ گئے تھے اور ڈکی کے میدان میں ہزاروں مسلمان قتل ہو چکے تھے !

گیارھواں باب

رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی - نیند آتی بھی تو چند لمحوں کے لیے آتی - اور ان چند لمحوں میں کبھی اپنے باپ کا چہرہ دیکھتا ، کبھی اُس بڈھے مسلمان کا سینہ بلم سے چھدا ہوا - اور ایک جھٹکے سے میری نیند اُچٹ جاتی - پھر دیر تک کروٹ بدلنے کے بعد غنودگی کا ایک ریلا سا آیا تو دیکھا کہ شاداں سر کے بال کھولے سرکنڈوں کے جنگل کی طرف چیخیں مار مار کر بھاگ رہی ہے اور سرکنڈوں کے جنگل میں آگ لگی ہے - پھر آنکھ کھل گئی - دیر تک کروٹ بدلتے بدلتے جب تیسرا پہر گزر گیا اور آنکھوں میں نہ نیند آئی نہ آنسو تو میں زمین سے اُٹھا اور باہر چل دیا -

ابھی صبح کاذب بھی نمودار نہ ہوئی تھی - چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا - صرف آسمان اور زمین کے درمیان تقسیم کرنے والی ایک سفید سی روشنی نمودار ہو چکی تھی جو آنے والی سحر کا پتہ دیتی تھی - میں اسی روشنی کے سہارے کیمپ سے باہر نکل آیا - دھیرے دھیرے میرے قدم ڈکی کے میدان کی جانب اُٹھنے لگے - میں جانا نہ چاہتا تھا لیکن کوئی طاقت تھی جو مجھے اُس طرف کھینچے لیے جا رہی تھی -

چلتے چلتے اندھیرا کم ہونے لگا - روشنی تو نہ تھی لیکن

غدار

کم تاریک اور زیادہ تاریک اشیا کا تفاوت بڑھتا جا رہا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کھڈ ہے ، یہاں کھائی ہے ، یہ ٹیلہ ہوگا ، وہ درختوں کا جھنڈ ہوگا ، موہوم پھیلے پھیلے سے سائے دم سادھے گویا سانس روکے روشنی کا انتظار کر رہے تھے ۔ میرے قدموں تلے ایک خرگوش خوفزدہ ہو کر بھاگا اور دور ایک ٹیلے کے بھٹ میں گھس گیا ...... ایک لمحے کے لیے میں چونک کر کھڑا ہوگیا ۔ پھر حواس جمع کر کے آگے بڑھ گیا ۔ سامنے موڑ پر برگد کا پیڑ تھا ، گہرا ، اتھاہ تاریک...... جیسے اس سیاہی کا کوئی کنارہ نہ ہو ......

موڑ کاٹ کر برگد سے آگے بڑھا تو سامنے ڈکی کا میدان نظر آیا ...... کہیں کہیں پر سنتری پہرہ دے رہے تھے ...

اب آئے ہو ۔ اُس وقت تم کہاں تھے جب زندگی نے تمھیں رو رو کر پکارا تھا ؟

سنتری نے مجھے للکارا : "ہالٹ !"

میں کھڑا ہوگیا ۔

سنتری نے میرے قریب آ کر مجھے دیکھا ۔ کرخت لہجے میں بولا : "کون ہو ؟"

"ہندو ہوں !"

"یہاں کیوں آئے ہو ؟"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا : "میری بندوق یہاں کھو گئی ہے ، اُسے لینے کے لیے آیا ہوں ۔"

سنتری کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ۔

اُس نے سر کو جنبش دے کر کہا :

"جاؤ ڈھونڈ لو ......"

میں ڈکی کے میدان میں داخل ہوگیا ۔

میرے چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں : بڈھوں کی لاشیں ، جوانوں کی لاشیں ، عورتوں کی لاشیں ، بچوں کی لاشیں ؛ اوندھی لاشیں ، سیدھی لاشیں ، اکڑوں لاشیں ؛ لاشیں جن کے دھڑ ننگے تھے ، لاشیں جن کے ہاتھ اکڑے ہوئے تھے ، لاشیں جن کی آنکھیں کھلی تھیں ، لاشیں جن کی آنکھیں بند تھیں ، لاشیں جن کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی ؛ لاشیں جو زندگی کا سارا زہر پی گئی تھیں اور اب ہمیشہ کے لیے سو رہی تھیں ۔

دور کہیں ایک بچہ رو رہا تھا ۔

میرے قدم بے اختیار اُس بچے کی آواز کی طرف لے گئے ۔ گرتا پڑتا ، لڑکھڑاتا ، لاشوں کو پھلانگتا ، کسی کے پاؤں اور کسی کے سر پر قدم رکھتا ہوا جب میں اُس آواز کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف لاشوں کا ایک انبار سا لگا ہے اور اُن کے بیچ ایک بچہ اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے رو رہا ہے اور کہہ رہا ہے :

"بابا ... بابا ... بابا مجھے بھوک لگی ہے ۔ بابا ... میرے بابا ..." بابا بچے کے قریب مرا پڑا تھا اور اُس کے سفید بالوں والے سینے میں بلم کا گہرا شگاف تھا ۔ ایک تاریک گہرا سیاہ شگاف ...... اور شگاف کے اردگرد سینے پر لہو انسان کی نفرت کی طرح منجمد ہوگیا تھا ۔

تھوڑی دیر تک میں چپ چاپ کھڑا رہا اور روتے بچے کو خاموشی سے دیکھتا رہا ، اور بچہ روتے روتے مجھے دیکھتا رہا ۔ پھر بچہ روتے روتے چپ ہوگیا ۔ اور اب ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ۔ اجنبی ، ناواقف ، بے گانہ ، لاشوں میں کھوئے ہوئے ، اور ہمارے درمیان کتنے بڑے فاصلے تھے ، کتنے گہرے سمندر تھے ، کتنی اُونچی فصیلیں تھیں ، اور ہم ایک دوسرے کی طرف ایک انجانی ، سمجھ میں نہ آنے والی حیرت سے تک رہے تھے ۔

بچے نے میری طرف دیکھا ، پھر اپنے اردگرد کی لاشوں کی طرف دیکھا ۔ اور پھر جب اُس کی ننھی سی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے سر جھکا کر اپنا ننھا سا انگوٹھا اپنے منہ میں ڈال لیا اور اُسے دھیرے دھیرے چوسنے لگا !

اور پھر جب اُس نے انگوٹھا چوستے چوستے سر اُٹھا کر یکبارگی میری طرف جو معصوم نظروں سے دیکھا تو گویا کسی نے میرے دل کی وائلن کو چھو لیا ۔ اُس رات کی خاموشی کا ہر ذرہ بول اُٹھا اور چیخ چیخ کر فریاد کرنے لگا ۔ اور سات سمندروں ، سات تہذیبوں ، سات فصیلوں اور سات نفرتوں کو روندتی پھلانگتی ہوئی اُس بچے کی بھوکی ، بلکتی ، بے قرار روح مجھ تک آئی اور اس زور سے میرے دل سے چمٹ گئی جیسے وہ ہمیشہ سے اس کا حصہ تھی اور میرے ہاتھ بے اختیار اُس بچے کی جانب اُٹھ گئے ۔ میں نے اُسے لاشوں کے انبار پر سے اُٹھا کر زور سے اپنے سینے سے لگا لیا اور رو رو کر اُس کا منہ چومنے لگا ۔

اور جب وہ مسلمان بچہ مسکتے ہوئے میرے گلے سے لگ گیا اور جب اُس کے ننھے ننھے ہاتھ میرے سینے پر سرکنے لگے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے انتقام کی ساری آگ بجھ گئی ، میرے دل کا سارا دکھ جاتا رہا ، میری ساری نفرتیں دھوئی گئیں ، میری روح کی ساری جلن اور تلخی مٹ گئی ۔ اُس لمحے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے میرا بچہ واپس مل گیا ۔

میں اُس بچے کو لیے کھڑا تھا اور چاروں طرف دیکھ رہا تھا ۔

اور میرے چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں ۔

اور میں نے آپ سے پوچھا : کس لیے ہم سر بلند ہو کر چلتے ہیں ؟ اور کس لیے ہم اپنی برتر تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ؟ اور کیوں ہم اپنے جرم کا اقبال کرنے سے قاصر ہیں ؟ ارے یہ نا مکمل ، نا پخت تہذیبیں اپنے دامن میں کتنے گھرے اندھیروں کو چھپا کر رکھتی ہیں ۔ یہ ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب ، عیسائی تہذیب اور سکھ تہذیب ، یورپی تہذیب اور ایشیائی تہذیب — ان چمکتی ہوئی تہذیبوں کے اندر کتنی گھری کھائیاں ، کیسی کیسی خوفناک تاریکیاں مستور ہیں لیکن وہ بتاتے نہیں ہیں ۔ وہ جو شب و روز ان تہذیبوں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ، وہ بتاتے نہیں ہیں ۔ اور جو کچھ وہ بتاتے ہیں وہ بہت ہی خوب صورت ، پر شکوہ اور شاندار ہوتا ہے ۔ اور اگر کوئی جرأت کر کے اس تہذیب کی خوشنما قبا کو ہٹا کر دیکھنا چاہے تو اُسے غدار سمجھ کر قتل کر دیا جاتا ہے یا اُس کی پیٹھ میں بلم بھونک دیا جاتا ہے ۔

مگر اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے ۔ اُن لاشوں پر سے چلتے چلتے یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے اب مجھے کسی کا ڈر نہیں رہا ، جیسے بہت عرصہ ہوا میں اپنا سر خود کاٹ کے پھینک چکا ہوں ۔ اب مجھے شاہراہوں کے ظلم پر حیرت نہ ہوگی ۔ میرے کان اُس آواز سے دھوکا نہ کھائیں گے جو اپنے مخملیں جوف میں ایک زہریلا خنجر چھپائے رہتی ہے ۔ اب میں کسی کے گناہ نہیں سونگھوں گا ۔ ان لاشوں پر سے چلتے چلتے جب میں نے اپنے سماج کی آدرش کو ٹٹولا تو میرے ہاتھوں کی ساری ریت بہہ گئی ، سارے زرد پتے ہوا میں بکھر گئے اور میں نے اُس مسلمان بچے کو گلے سے لگا کر اپنے پرانے رسم و رواج کے غلیظ ڈھیر کو آگ لگا دی ۔ چلتے چلتے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اب میں بہت مطمئن ہوں اور کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا کیونکہ میں ایک سربریدہ انسان ہوں جسے صرف ایک سبز پتے کی تلاش ہے !

میدان سے نکل کر پہرے دار نے پھر مجھے ٹوکا ۔

میں نے کہا : ”مجھے بندوق نہیں ملی ۔“

”تو تم اس بچے کو کیوں اُٹھا لائے ۔“ پہرے دار نے پوچھا ۔ اُس کے لہجے میں تلخی اور سختی تھی ، جیسے اُسے میری حرکت پسند نہیں آئی ۔

”یہ زندہ ہے !“ میں نے اُس سے کہا ۔

”زندہ ہو یا مردہ ، تمھیں اس بچے کو اُٹھانے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اسے وہیں چھوڑ دو ۔“

”مگر میں اسے مارنا چاہتا ہوں ۔“ میں نے پہرے دار کو

آنکھ مار کر کہا ، "یہ سانپ کا بچہ ہے - زندہ کیوں رہے !"

پہرے دار کے چہرے پر شک و شبہات کے آثار نمودار ہوئے ، رک رک کر بولا :

"تم واقعی اس کو جان سے مار دو گے ؟"

میں نے کہا : "ارے ! میں اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا - دونوں ٹانگوں سے چیر کر اسے دریا میں بہا دوں گا -"

میں نے پھر پہرے دار کو آنکھ مار دی -

پہرے دار ذرا سا مسکرایا - توقف کے بعد بولا :

"تم اسے لے جا سکتے ہو -"

بچہ زور زور سے رونے لگا - میں بچے کو لے کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا - یکایک پہرے دار نے پیچھے سے چلا کر کہا : "ٹھہرو !" مگر میں نے کچھ نہیں سنا - میں نے اپنی چال تیز کر دی اور زور زور سے بھاگنے لگا - یکایک ایک گولی کی آواز آئی اور گولی میرے پاؤں سے چھچھلتی ہوئی خاک اُڑاتی ہوئی گزر گئی مگر میں بھاگتا رہا اور بھاگتے بھاگتے ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھپ کر اپنا زخم دیکھنے لگا جس سے خون بہہ رہا تھا -

راوی پر صبح ہوگئی -

اور میں دریا کے کنارے اس بچے کو اُٹھائے سوچ رہا تھا :

اب تو کہاں جائے گا ، بیج ناتھ ؟ ظلم اور تشدد ، نفرت اور تعصب کے جس طوفان سے بھاگ کر وہاں سے آیا تھا وہ تو یہاں بھی موجود ہے اور تو ، جو اب ان دونوں تہذیبوں کا

غدار ہے ، تو ان سے بچ کر کہاں جائے گا ؟ تو اب نہ ہندوستان کا رہا نہ پاکستان کا ۔ جب تیرے لیے ان دونوں ملکوں کی نفرتیں اجنبی ہو چکیں تو پھر تو اس انسانیت سے خالی ، لق و دق ، ویران دنیا میں اس بچے کو لے کر کہاں اپنا ٹھکانہ بنائے گا ؟ بھول جا ان تمام آدرش اور تخیلی باتوں کو اور جھونک دے اس بچے کو طوفان کے ریلے میں اور واپس چلا جا اپنے گھر میں اور خاندان میں ؛ قوم اور ملک ، سماج اور اُس کی تہذیب میں ۔ اب وہ دیس تیرا دیس نہیں رہا ، اب یہی دیس تیرا دیس ہے !

ہائے کیسے کہوں وہ دیس میرا دیس نہیں ہے جس کی مٹی کا ایک ایک ذرہ میرے دل میں ہیرے کی طرح روشن ہے ! اور کیسے کہوں صرف یہی دیس میرا ہے جہاں میرے بہت سے احساس اجنبی ہیں ۔ مجھے تو راوی کے اس کنارے میں اور اُس کنارے میں کوئی فرق نہیں نظر آتا ۔ دریا کے دونوں کناروں پر ریت کے تودے ہیں اور دونوں کناروں پر لاشیں پڑی ہیں اور بیچ میں راوی کا وہی پانی بہہ رہا ہے جو اس دھرتی پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی بہتا رہا ہے !

اور پھر میرے دل میں اُس زمانے کی یاد آئی جو ابھی آیا نہیں ہے لیکن جو آنے والا ہے ۔ جب ہندوستان ہوتے ہوئے بھی کوئی ہندوستان نہ ہوگا اور پاکستان ہوتے ہوئے بھی کوئی پاکستان نہ ہوگا ؛ کوئی ایران نہ ہوگا اور کوئی افغانستان نہ ہوگا ؛ کوئی امریکہ نہ ہوگا اور کوئی روس نہ ہوگا ؛ کوئی چین نہ ہوگا اور کوئی جاپان نہ ہوگا ؛ جب یہ ساری دھرتی اس

غـــدار

دنیا کے سارے انسانوں کے لیے ایک چھوٹا سا گاؤں بن جائے
گی جس میں تمام انسان اپنی اپنی گلیوں میں رہتے ہوئے ایک
دوسرے سے محبت اور اُلفت ، ہمسایگی اور آزادی اور برابری
کا برتاؤ کرتے ہوئے امن و چین سے رہیں گے -

ارے کیوں میں ایسا سوچتا ہوں ؟ کیوں میں ایسا سوچتا
ہوں ؟ اور کیوں اُسی طرح سے نہیں سوچتا جس طرح سے دوسرے
شریف اور مہذب اور متمدن ، عاقل اور فاضل انسان سوچتے ہیں ؟
اپنے اپنے ملکوں ، مذہبوں ، سماجی اداروں اور گروہ بندیوں میں
بٹے ہوئے ؛ رنگ ، نسل ، ملک اور قوم کی تفریق اپنے سینے
سے چمٹائے سوچتے ہیں ؟ آخر مجھے ہوا کیا ہے ؟ ہوا کیا ہے ؟
یہ کیسی جان لیوا کاہش ، خواہش اور تمنا ہے جو میری روح
کو ہر لحظہ اپنے مضطرب مضراب سے مرتعش کیے جاتی ہے ؛
جو میرے ضمیر سے بار بار کہتی ہے کہ کوئی کچھ کہے ،
کوئی مانے نہ مانے مگر اب ایک دن ضرور ایسا ہوگا ؛ وہ دن
آج آئے ، کل آئے ، سو سال بعد آئے ، سو ہزار سال بعد آئے ؛
لیکن اگر انسان اشرف المخلوقات ہے ، اگر اُس کی زندگی کا
کوئی مصرف ہے ، اگر اُس کی تہذیب کا کوئی مقصد ہے ،
اگر اُس کے مستقبل کی کوئی معراج ہے تو وہ دن ضرور آئے
گا جب انسان اپنی جان پر کھیل کر ، اپنی تمام خامیوں سے
لڑتے ہوئے ، اپنی وحشی جبلتوں پر قابو پاتا ہوا ، فطرت کے
ہر راز کا سینہ چیر کر بلند و بالا انسانیت کی درخشاں منزل کو
چھو لے گا !

وہ دن ضرور آئے گا ؛ ضرور آئے گا -

اور اُس دن کے انتظار میں مجھے زندہ رہنا ہوگا اور اس بچے کو اپنے سینے سے لگائے اسے بھی زندہ رکھنا ہوگا ۔ بھیاتی ہوئی تـاریکی میں بھاگتی ہوئی روشنی کو دانتوں سے پکڑ پکڑ کر زندہ رکھنا ہوگا ، تاریکی کے گرتے ہوئے ملبے میں سے روشنی کی کرن کو ناخنوں سے کرید کرید کر نکالنا ہوگا اور اُسے اپنے سینے سے چمٹا کر حرز جـاں بنانا ہوگا ۔ وہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے ور تھوکیں گے اور نفرت سے اپنا منہ پھیر لیں گے مگر مجھے اس زہر کو پی کر انسانیت کے وقـار کی مشعل کو اپنے سینے میں فروزاں کیے اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہوگا !

بچے نے میری طرف حیران نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا :

”تو تون ہے ؟“

میں نے کہا ، ”میں تیرا چاچا ہوں ۔“

”چـاچـا ؟“ بچے نے ڈرتے ڈرتے پوچھـا ، ”تو مجھے روتی دے گا ؟“

”ہاں ، میں تجھے روٹی دوں گا ۔“ میں نے اُس سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ، ”روٹی جو ہم دونوں میں مشترک ہے ۔“

اور پھر میرے چاروں طرف ، دریا کے اس کنارے سے اُس تک ، روشنی چمک اُٹھی ۔ میں نے بچے کو دونوں ہاتھوں میں اُوپر اُٹھا کر اُس کے گالوں کو بوسہ دیـا ، اُس کی پیشانی کو چومـا اور اُسے اپنے کندھے پر بٹھا کر اُمید کی اُس وادی کی طرف چلا گیا جہاں سورج کبھی نہیں ڈوبتا !

اختتامیہ

کرشن چندر

میرے دوست اور اس کتاب کے ناشر نذیر احمد چودھری نے مجھ سے ایک سوال پوچھا ہے :

"تم ماضی کے لیے کیوں روتے ہو ؟"

- "جو ہو گیا سو ہو گیا ۔ وہ برا اور بھیانک تھا ، قابلِ مذمت تھا ، اُسے یاد کر کے شریف انسانوں کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے مگر اب ان باتوں کو کیوں دہراتے ہو ؟ گڑے مردے کیوں اُکھاڑتے ہو ؟ آج بہت سے لوگ ان تلخ واقعات کو بھولتے جا رہے ہیں ۔ آج ہمارے درمیان ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان وحشیانہ مظالم کے
- ملبے سے بہت اُوپر تعمیرِ نو کے خواب دیکھتی ہے ۔ تم اُنھیں اس طرح کی باتیں کیوں سناتے ہو ؟ تم ان کے معصوم دلوں تک اُس مہیب ماضی کی بازگشت لے کر کیوں آتے ہو ؟"

"تم ماضی کے لیے کیوں روتے ہو ؟"

اس لیے کہ میرے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے !

مجھے معلوم ہے بہت سے لوگوں کے آنسو خشک ہو چکے

ہیں۔ بہت سے لوگوں کے پاس کبھی آنسو ہی نہ تھے۔ اگر میرے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے تو میں کیا کروں ؟

میں نے اس دوران میں بہت کوشش کی ہے کہ اپنے دل سے انسانی جذبے کا سارا رس نچوڑ کے پھینک دوں اور حالات و واقعات کو اُسی طرح چبا کے کھاؤں جس طرح لوگ سوکھے ہوئے آلو کھاتے ہیں مگر میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے اپنی ناکامی کا اعتراف ہے!

یہ درست ہے کہ آج بہت سے لوگ اُن تلخ واقعات کو بھولتے جا رہے ہیں جنھوں نے اس ناول کو جنم دیا ہے لیکن وہ اس نفرت کو نہیں بھولتے جس نے ان تلخ واقعات کو جنم دیا تھا۔ وہ نفرت آج بھی دلوں میں ایک ناگ کی طرح کنڈلی سارے اپنے پھن کو دم میں دبائے بیٹھی ہے اور کسی موقعے — کسی ایک موقعے کی تلاش میں ہے۔ موقع پاتے ہی وہ صدیوں پرانی نفرت ناگ کے پھن کی طرح اُٹھ کھڑی ہوگی اور پورے برِصغیر کو ڈس لے گی۔ اگر کسی کو میری بات کا یقین نہ آئے تو اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھ لے!

میں نہیں چاہتا کہ وہ موقع کبھی آئے۔ میں اِس نفرت کو ترسا ترسا کر بھوکا مار دینا چاہتا ہوں کیونکہ ہندوستان میں ایک یا دو نہیں لاکھوں انسان ایسے ہوں گے جو پشاور تک اکھنڈ بھارت کو پھیلا دینے کے خواب دیکھتے ہیں۔ پاکستان میں ایسے انسانوں کی کمی نہیں جو دلی پر ہلالی پرچم لہرا دینے کے متمنی ہیں اور اُس کے لیے لاکھوں کی تعداد میں جان

دینے کے لیے تیار ہیں ۔ یہ لوگ ایک یا دو ہوتے ، چند سر پھرے ہوتے تو ڈرنے کی کوئی بات نہ تھی ۔ مگر نفرت کرنے والے بہت بڑی تعداد میں ہیں ۔ یہ لوگ طاقتور بھی ہیں اور سربلند بھی ہیں اور شاید ہی ہندوستان اور پاکستان میں کوئی ایسا گھر ہو جو اس نفرت سے خالی ہو ۔ اس لیے کیا میں غلط سوچتا ہوں اگر میں ان خوابوں سے ڈرتا ہوں ! پہلے تو خواب ہی خوابوں سے ٹکراتے ہیں ، اسلحہ جات تو بہت بعد میں انسان کے ہاتھ میں دیے جاتے ہیں !

انسان نے اپنی چھوٹی سی تاریخ میں طرح طرح کے خواب دیکھے ہیں : اچھے خواب بھی ، برے خواب بھی ۔ کچھ خوابوں نے ریگستانوں میں بستیاں آباد کی ہیں ، کچھ خوابوں نے ہری بھری بستیاں برباد کی ہیں ۔ ایک خواب نے کھیت میں ہل چلایا ہے ، دوسرے نے اُس کی فصل کو نذرِ آتش کیا ہے ۔ ایک خواب سے پھول اُگتے ہیں ، دوسرے سے ایٹم بم گرتے ہیں ۔ میں اچھے خوابوں کی عزت کرتا ہوں ، برے خوابوں کی مذمت کرتا ہوں ۔

نفرت کرنے والوں کو طاقتور یورپ کی گزشتہ تین سو سال کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ اس عرصے میں مغرور یورپ نے بہت بڑے بڑے خواب دیکھے ۔ بہت اچھے خواب بھی اور بہت برے خواب بھی ۔ انسان کے دل میں اُس کا خواب کچی مٹی کی طرح ہے جسے وہ اپنے عمل کے چاک پر رکھ کر ہزاروں صورتوں سے جلوہ گر کر سکتا ہے ۔ آج ہماری زندگی کا کوئی کونہ یورپ کے خوابوں سے خالی نہیں ہے ۔ ہم نے قومی سطح

پر نفرت کرنے کا فلسفہ بھی یورپ سے مستعار لیا ہے اور یہ نہیں سوچا کہ اس فلسفے نے یورپ کی کیا گت بنائی ہے ! اچھی شے کہیں سے بھی ملے مستعار لے لو ۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ لیکن نفرت سے اس قدر اندھے نہ ہو جاؤ کہ برے اور بھلے خواب کا فرق بھول جاؤ ۔ میں تو صرف اتنا ہی کہتا ہوں کچی مٹی کی عزت کرو ۔ بے تھوون کا نغمہ ہمیں دے دو ، ٹینک کیوں دیتے ہو ؟ وینس کا مجسمہ ضرور بناؤ ، جنگ کا نقشہ کیوں بناتے ہو ؟ بے تار برق سے اپنا پیغام اپنے محبوب تک پہنچا دو ، اُس سے راکٹ کیوں گراتے ہو ؟

مجھے اس بات کا بھی اقرار ہے کہ نفرت بے سبب پیدا نہیں ہوتی ۔ اس کے کچھ مادی اسباب ہوتے ہیں ، کچھ تاریخی حالات ہوتے ہیں ، کچھ مذہبی اور تہذیبی محرکات ہوتے ہیں جن سے یہ نفرت بڑھتی اور پھیلتی ہے ۔ پھر اس نفرت کے ساتھ ساتھ کچھ مخصوص مفاد بھی وابستہ ہو جاتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں تا کہ نفرت بڑھتی اور پھیلتی رہے ۔ گمراہی ترقی کرے اور ایک انسان دوسرے انسان پر ، ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ پر ، ایک پوری قوم دوسری پوری قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دے ۔ کبھی کبھی بالکل جائز مطالبات کی بنا پر ، اپنے نصب العین کو درست سمجھتے ہوئے ، اپنے ضمیر کی مکمل طمانیت کے ساتھ ......

آج ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان جو نفرت کی دیوار کھڑی ہے ، تجزیہ کرنے والے اُس کا تجزیہ بھی بالکل اسی طرح کرتے ہیں ۔ اور میں کب کہتا ہوں کہ وہ غلط کرتے ہیں ۔

اختتامیہ

میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ تو بالکل دوسری ہی بات ہے ! ——— میری مصیبت یہ ہے کہ میں آج بابر کو بلا کر اُس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے ہندوستان پر حملہ کیوں کیا ؟ یہ بہت بری بات ہے میاں ! اپنے گھر لوٹ جاؤ ! میں آج شیوا جی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کا علم کیوں بلند کرتے ہو ؟ میں ہندو سے اُس کا وید اور مسلمان سے اُس کا قرآن نہیں چھین سکتا ۔ میں مسلمان کو گوشت کھانے سے منع نہیں کر سکتا ۔ ہندو کو دھوتی پہننے سے روک نہیں سکتا ۔ میں کسی سے اُس کا مذہب ، اُس کا کلچر ، اُس کی تاریخ ، اُس کے مخصوص تمدنی ، تہذیبی اوصاف چھیننا نہیں چاہتا ۔ میں صرف وہ نفرت چھین لینا چاہتا ہوں ——— وہ جو تمہارے سینے میں دبی پڑی ہے کیونکہ آج تلوار اتنی خون آشام ہو چکی ہے کہ وہ انسان کے کسی خواب کو پورا نہ کرے گی : اُس کے اچھے خواب کو نہ اُس کے برے خواب کو ......

یورپ نے ڈھائی سو سال ساری دنیا پر حکومت کی ۔ آج اُسے ہر جگہ سے مار مار کر بھگایا جا رہا ہے ۔ فرانس نے سارے یورپ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا تھا ۔ آج اُس کی کیا حالت ہے ؟ جرمنی نے گزشتہ دو جنگوں میں جہانبانی کا خواب پورا کرنا چاہا ۔ آج خود جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں ۔ آج تلوار کی دھار اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ جو اُسے ہاتھ میں لے گا خود اُس کا ہاتھ کٹ جائے گا ۔

پھر یورپ کے مقابلے میں ہماری حیثیت ہی کیا ہے ؟ جمعہ

غـــدار

جمعہ سات دن تو ہوئے ہیں ہمیں آزادی حاصل کیے ہوئے۔ اور اس قلیل عرصے میں ہمیں اپنی اپنی جگہ اس قدر دشوار مسائل سے دو چار ہونا پڑا ہے، ایسی ایسی ٹیڑھی سماجی، سیاسی اور اقتصادی الجھنیں ہمارے سامنے آئی ہیں جنھیں سلیقے سے سلجھانے کے لیے سو سال کی مدت بھی کم ہوگی۔ ان حالات میں ہم لوگ کسی طرح ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی خطرناک ذہنی عیاشی کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ ہمیں تو اس کا حق بھی نہیں پہنچتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے نفرت کریں! اور ہمارے پاس ہے کیا جس کے بل بوتے پر ہم اس قدر غرا غرا کر ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے ہیں گویا کچا ہی کھا جائیں گے۔ اناج کے دانے دانے کے لیے ہم باہر والوں کے محتاج ہیں۔ کپڑے کی فراوانی کا یہ حال ہے کہ آج بھی اس برصغیر کی آدھی آبادی نیم برہنہ گھومتی ہے۔ اسلحہ جات کے لیے ہم دوسروں کا منہ دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے لیے سائنس کا علم آئے تو باہر سے، کلچر کی نئی قدریں دریافت ہوں تو باہر سے۔ پاخانے کا کموڈ اور غسل خانے کی ٹائلیں تک تو دساور سے آتی ہیں۔

گویا گیہوں سے گورکی تک اور حمام سے ہمنگوے تک ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔ ایسے لوگوں کو آستین چڑھا چڑھا کر طرم خاں بننا کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم لوگ اپنی اپنی کھال میں رہیں، اپنا اپنا ملک سنبھالیں اور اُن غریبوں کو دیکھیں جو کب سے ایک روٹی، ایک گز کپڑا اور ایک چھت کی آس ہم سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں انتہائی سنجیدگی

سے اپنی ذہنی تربیت کرنا چاہیے ورنہ نفرت کی یہ زہریلی پھپھوندی دونوں ملکوں کو چاٹ جائے گی !

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں : "اچھا صاحب ماضی کی نفرت کو بھاڑ میں ڈالو ، لیکن یہ جو آج کل کے مسائل دونوں ملکوں کے درمیان نفرت پیدا کر رہے ہیں اُس کا کیا ہوگا ؟ آخر کشمیر کا مسئلہ ہے ، سرحدوں کا مسئلہ ہے ، نہری پانی کا تنازع ہے ، اقلیتوں کا جھگڑا ہے - آخر یہ سب باتیں ہی تو نفرت پیدا کرتی ہیں ورنہ کیا ہم اپنے باپ کے گھر سے نفرت لے کر آئے ہیں ؟"

اس بات کا جواب تو یہی ہے کہ ہاں واقعی آپ اپنے باپ کے گھر سے یہ نفرت لے کے آئے تھے جنھوں نے یہ نفرت ایک عزیز ترین ترکے کی صورت میں آپ کو ودیعت کی تھی اور آپ اسے ایک قیمتی ورثے کی طرح اپنے بچوں کو دونوں ملکوں میں الگ الگ سونپ رہے ہیں - گویا وہ سانپ جو کل تک صرف تمھارے دل میں تھا ، تمھارے بعد تمھارے بچوں کے دل میں بھی پرورش پاتا رہے گا اور کسی مسئلے کا کوئی حل سامنے نہ آ سکے گا اور دلوں کے اندر کدورتیں بڑھتی جائیں گی اور یہ زہر نسل در نسل پھیلے گا اور ایک روز طوفان کی صورت میں پھٹ پڑے گا اور افسوس اُس روز تم یہ کہنے کو موجود نہ ہو گے : "یہ وہی سانپ ہے جسے ہم نے دودھ دے کر پالا تھا !"

مگر ظاہر ہے لوگ اس جواب سے خوش نہیں ہوتے - وہ کہتے ہیں : "صاحب ہم سچائی پر ہیں - ہم حق کے لیے لڑتے

ہیں اور اپنے حق کے لیے جان دینے کو عین سعادت سمجھتے ہیں اور اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے اگر جنگ بھی کرنا پڑے تو کیا مضایقہ ہے ؟"

واقعی کوئی مضایقہ نہیں ہے ۔ کبھی کبھی میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں ۔ بابر نے غالباً صرف سولہ ہزار سپاہی لے کر ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا ۔ اس میں سے زیادہ سے زیادہ آدھے مرے ہوں گے ۔ اب اگر آٹھ ہزار سپاہیوں کی جان کے عوض ایک پورا ملک ہاتھ میں آئے تو کیا برا ہے ؟

کلائو نے اس سے بھی کہیں کم انگریز سپاہی لے کر بنگال پر حملہ کر دیا تھا ۔ ہسپانیوں نے سولھویں صدی میں صرف چھ سو سپاہیوں کی مدد سے میکسیکو فتح کر لیا تھا ۔

واقعی کیا زمانے تھے ! انسان میں تھوڑی سی شجاعت ہو ، اچھی صحت ہو اور دوسروں کو اپنی لوٹ مار میں شریک کرنے کا سلیقہ ہو تو چند سو سپاہی لے کر باہر نکل جائے اور ایک چھوٹی موٹی ریاست داب کے بیٹھ جائے ۔ ناکام ہوئے تو ڈاکو بن بیٹھے ، کامیاب ہوئے تو راجہ کہلائے ! بڑے عمدہ زمانے تھے ! وہ زمانے ہوتے تو اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟

مگر مصیبت یہ ہے کہ زمانہ بدل چکا ہے ۔ آج کی جنگ عزم ، بہادری ، شجاعت ، ولولے اور حق اور راستی کی جنگ نہیں ہے ۔ پہلے زمانے میں ایک تلوار ایک یا دو یا دس آدمیوں کا خون پیتی تھی ، آج ایک بم ایک کروڑ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کی قوت رکھتا ہے ۔ اس میں شجاعت ،

اختتامیہ

شہادت ، حق ، راستی کا سوال ہی کہاں اُٹھتا ہے ؟ آج کی جنگ میں دونوں طرف اس قدر شدید مالی و جانی نقصان ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد برسوں تک یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون جیتا اور کون ہارا ؟ سنتے ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم جرمنی ہارا تھا ۔ اس کے بعد یہ بھی سنا کہ جرمنی اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ تاوانِ جنگ ادا نہیں کر سکتا ، جب تک کہ اُس کی اقتصادی حالت کو پھر سے درست نہ کیا جائے ۔ تاوانِ جنگ حاصل کرنے کے لیے جرمنی کی ہر طریقے سے مدد کی گئی ۔ اور جب جرمنی اس قابل ہوا کہ تاوانِ جنگ ادا کر سکے تو جرمنی نے پھر جنگ کر دی ۔ دوسری جنگِ عظیم میں پھر اُسے شکست نصیب ہوئی ۔ اب پھر اُسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے کروڑوں بلکہ اربوں کی رقم پانی کی طرح بہائی گئی ہے ۔ یعنی پہلے تو اپنے حریف سے لڑو ، اور جب وہ لڑ کر ہار جائے تو اُس کی مدد کرو ، اور جب وہ ہار کر پھر آپ کی مدد سے لڑنے کے قابل ہو جائے تو پھر اُس سے لڑو ! ! ! میری سمجھ میں تو یہ حماقت آتی نہیں ہے ! میری نظر میں وہ سچائی نہیں ہے جس کا نتیجہ پوری قوم کی تباہی ہو ۔ وہ حق ہی کیا جو صرف کھنڈر کی صورت میں عیاں ہو ؟ جس مقصد کے لیے جنگ کی جائے وہ مقصد ہی اگر دورانِ جنگ میں فوت ہو جائے تو اُس جنگ کا کیا فائدہ ؟

اس لیے سب سے اچھا طریقہ آپس کی نفرتوں کو دھو دینے کا ہے ، اور صلح و آشتی کے رجحانات کو ترقی دے کر باہمی سمجھوتے سے تمام مسائل کو حل کرنے کا ہے ۔ یہ اکیلی

Naile Naile

غــدار

میری آواز نہیں ہے۔ یہ اُردو کی آواز ہے۔ یہ اس برِصغیر کے اُردو ادیبوں کی آواز ہے۔ یہ وہ گھلی ملی، رچی بسی، تہذیبی پکار ہے جسے سب سے پہلے اُردو کے ادیبوں نے ۱۹۴۷ کے فسادات میں بلند کیا تھا۔ یہ انسانیت کے دل سے نکلی ہوئی، سوچی سمجھی، سنجیدہ، متین اور تاریخی پکار ہے۔ اور اس کی اہمیت کی صحیح پہچان اس میں ہے کہ اس برِصغیر پر ہندوستان والے پاکستان کی آزادی کو اپنی آزادی کی طرح عزیز رکھیں اور پاکستان والے ہندوستان کی خود مختاری کو جزوِ ایمان بنا لیں اور دونوں فریق مل بیٹھ کر ہر مسئلے کو پر امن طریقے سے حل کریں، ایک دوسرے کے ہمدرد دوست اور عزیز ہمسایوں کی طرح حل کریں ورنہ اگر تلوار نکلی تو چند ماہ میں نہ ہندوستان ہوگا نہ پاکستان ہوگا — جدھر نظر دوڑائیے گا قبرستان ہی قبرستان ہوگا کیونکہ آنے والی جنگ، چاہے وہ کسی مسئلے پر چھڑے، بہت جلد ایک عالمگیر جنگ کی صورت میں تبدیل ہو جائے گی اور اُس صورت میں اس برِصغیر کے دونوں ممالک کی آزادی اور سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی!

اس لیے میں نفرت کے خلاف لڑتا ہوں اور ماضی کے کھنڈر دکھاتا ہوں!

میں ماضی کے لیے نہیں روتا۔

میں مستقبل کے لیے روتا ہوں۔

اور آنے والے خطرے سے خبردار کرتا ہوں!